ادھورے چہرے
شمیم صادقہ

ادھورے چہرے

(افسانوں کا مجموعہ)

شمیم صادقہ

©

ادھورے چہرے از شمیم صادقہ

تعداد :- پانچ سو

قیمت :- چھ روپے

ناشر :- بھوپال بک ہاؤس بدھوارہ - بھوپال

۴۶۲۰۰۱

سنہ اشاعت :- ۱۹۸۰ء

کتابت :- کفیل احمد خاں

طباعت :- پاشا پرنٹنگ پریس بھوپال

"ہر اک چہرے کے پیچھے سینکڑوں کردار ملتے ہیں
کسی بھی آدمی کا ایک سا چہرہ نہیں مِلتا"

انتساب

اپنی والدہ محترمہ کے نام

جنکی شخصیت کے ضبط و توازن نے مجھے زندگی کے پیچ و خم سے آشنا کیا۔ اور بتایا کہ

مصالحت سے

آنکھوں میں یہ پہچان کے ڈورے نہیں اچھے
گذرے ہوئے موسم کو بھلا کیوں نہیں دیتے

اور کرب سے

اجنبی لوگ بھی ملتے ہیں شناسا کی طرح
میرے چہرے پہ ترا نام لکھا ہو جیسے

کے تقاضے کیا ہیں ۔۔۔ ؟

یہ مجموعہ شخصیت کی تربیت کرنے والی اسی عظیم ہستی کے نام ممنون ہے۔

عرضِ حال

"ادھورے چہرے" یہ میرے افسانوں کا دوسرا مجموعہ آپ کے سامنے ہے پہلا مجموعہ "کرچیاں" جب زیرِ طبع تھا میں بہت نروس تھی۔ پتہ نہیں، میری کہانیوں کی یکجائی پڑھنے والوں کو کیسی لگے۔ میں واقعی گھبرا رہی تھی۔ لیکن جب نقادوں اور فنکاروں نے اسے سراہا، میری ہمت افزائی کی اور مجھے ذاتی طور پر اس کے متعلق لکھا تو میری پریشانی تقویت میں تبدیل ہونے لگی۔ مگر اس کا مطلب کوئی کامپلکس نہیں۔ نہ پہلے اور نہ اب۔

پھر جب دوسرے مجموعے کی بات آئی تو میں نے اس کی ترتیب الگ انداز سے کی۔ "کرچیاں" کربِ وفا اور احساسِ نارسائی کی ٹیس تھی۔ لیکن اس مجموعے میں میں نے ان افسانوں کو یکجا کیا ہے جن میں زندگی کے ادھورے پن کی عکاسی ہے۔ کھوکھلے نظریات کا ملبہ ہے۔ انسانیت کے ٹوٹے بکھرے کھنڈر ہیں

میرا خیال ہے انسان خواہ کسی طبقہ کا، کسی معاشرے کا، کسی سطح کا ہو آج بھی اپنے اندر آئیڈیلزم کا ایک کردار رکھتا ہے لیکن حقیقتوں کی تیز آندھی جب اندر کے آئیڈیلزم سے ٹکراتی ہے تو اس کے بعض حصے ٹوٹ پھوٹ جاتے ہیں کسی شاعر نے کہا ہے ؎

ہزاروں بار جیتے جی مجھے مرنا مقدر تھا
سلامت ہے بظاہر میری خیریت پھر بھی

یہ المیہ عہد کا ہے۔ فرد کا نہیں مگر کسی حد تک فرد بھی اس کا ذمہ دار ہے۔ اس مجموعے میں ایسے ہی ادھورے چہروں کی تشبیہ ہے۔ اور ایک دعوتِ فکر بھی۔ کہ یہ ادھورا پن کیوں ہے؟ کس لئے ہے؟ اس کی ذمہ داری کس پر عائد ہوتی ہے —— کیا یہ ہم ہی تو نہیں جو اپنی کمی کا جواز، حالات کے مدوجزر میں ڈھونڈ ڈھونڈ کر خود کو مطمئن کر لینے کی حد تک بے حس ہو چکے ہیں۔

میں نے جو کچھ عرض کیا، وہ صرف موضوع کی وضاحت سے

متعلق تھا۔ تاکہ مجموعی تاثر کی ہم آہنگی کی سمت واضح ہو۔ اور بس ــــ میں اپنے متعلق پڑھنے والوں پر کچھ بھی اپوز کرنا نہیں چاہتی ــــ آپ پڑھئے ۔ اپنی رائے اپنی بے لاگ تنقید، اپنا تبصرہ، اپنی پسند و ناپسند کا آپ کا اختیار، کلی طور پر آپ ہی کا ہے ۔ میں خود وضاحتی کی ازم سے پناہ مانگتی ہوں ۔ بلکہ جب بھی اپنے متعلق، فرد غیر متعلق بن کر سوچا، کچھ یوں محسوس ہوا ہے ؎

عجیب شہر خموشاں ہے، شہر احساسات

اچھا تو میری گذارش ہے کہ مجھے اپنی رائے مزید لکھنے گا آپ کی رہبری میرے لئے صدائے جبرئیل سے کچھ کم نہیں۔

شمیم صادقہ
شعبہ اردو
گورنمنٹ ویمنس کالج، مریم منزل
گردنی باغ پٹنہ ۔ ۸۰۰۰۰۲

فہرست

بجھی ہوئی تیلی

جب کوئی گھر کا نہیں ہوتا تو بازار اسے اپنا لیتا ہے۔ بازار کے سینے میں بڑی وسعت ہوتی ہے۔ خود غرض اور بے حس انسان کی طرح بازار اپنی غرض کے تحت اسے اپنا لیتا ہے، انگیج کر لیتا ہے اور چیونگم کی طرح جب رات بھیگنے لگتی ہے۔ تھوک دیتا ہے، کہیں، کسی جگہ بھی ——

میرا بھی کوئی گھر نہیں —— میں ڈیڑھ سو روپے ماہوار کا ایک "اشوٹنگ" ہوں —— اگر میں طبلچی جیسی یہ پہچان رکھنے کے بجائے "ٹائپسٹ" ہوتا تو بھی کیا فرق پڑتا ہے۔ ہر ایک ملازمت شخصیت کی تخریب نے تعمیر کی طاقت رکھتی ہے۔ میں شام ڈوب جانے کے بعد پیدل گھر آتا ہوں۔ جو ایک خستہ حال کمرہ اور ایک چھوٹے سے برآمدے پر مشتمل ہے۔ تالا کھولتا ہوں پچیس پاور کا زرد بلب جلا کر اپنی اکلوتی قمیص کو بنیٹ سے آزاد کرتا ہوں گنجی کو پسینے کی بدبو سمیت پھیلا دیتا ہوں جو بالکل بھیگی ہوئی ہوتی ہے اور جس کا رنگ میلا پڑ چکا ہے۔ تھوڑی دیر بعد بغل کے غفور ہوٹل کا رخ کرتا ہوں۔ جہاں تام چینی کی رکابی میں جلی جلی سی تین بے حد پتلی اور خشک روٹیاں اور تام چینی کے ہی ایک چھوٹے

سے اُبلے بادل میں مرچ سے سرخ شوربے میں تیرتی ہوئی اکلوتی بوٹی میرے سامنے رکھ دی جاتی ہے۔ جسے میں کئی کئی گلاس پانی کے ساتھ، ایک غیر شعوری سمجھوتے کے ساتھ کھا لیتا ہوں۔ تاکہ پیٹ خوب بھرا ہوا محسوس ہو۔ کبھی کبھار ایک کپ بھیم ابلی ہوئی چائے کی پی لیتا ہوں۔ پھر ٹہلتا ہوا بازار کی طرف چل دیتا ہوں۔ جسے کچھ لوگ "اسٹیشن" کہتے ہیں۔ خصوصاً وہ لوگ جو یہاں کے قدیم باشندے ہیں۔ نئی نسل "نیو مارکیٹ" کا نام دیتی ہے۔ اور پیشے والے صرف "مارکیٹ" ——— لفظوں کا استعمال اپنے آپ میں کیا نہیں ہوتا!

میں یونہی گھومتا رہتا ہوں۔ یہاں تک کہ آہستہ آہستہ دکانوں کی روشنیاں گل ہونے لگتی ہیں۔ شٹر گرائے جانے لگتے ہیں۔ بھیڑ کم ہوتے ہوتے اکا دکا مشکوک افراد پہ آ کے رک جاتی ہے میں بہت ہی سست رفتار سے آہستہ آہستہ چل کے گھر آتا ہوں ——— بستر کی چار خانے والی چھ رنگی پتلی چادر کو جھاڑ کے پھر سے بچھاتا ہوں جو تھوڑی ہی دیر بعد سمٹ سمٹا کر کبھی پیٹھ کے نیچے گڑنے لگتی ہے اور کبھی پیروں کا از خود تکیہ بن جاتی ہے پھر سخت اور بے آرام تکیہ پہ سر ڈال کے سو رہتا ہوں۔ صبح سویرے سامنے کے نل پہ نہاتا ہوں۔ چھوٹی سی صراحی میں پانی بھرتا ہوں۔ کمرے میں جھاڑو لگاتا ہوں ——— پرانا "سمیع" ڈھونڈ کر دیکھتا ہوں۔ یہاں تک کہ تھوڑا وقت اور گزر جاتا ہے۔ نو بجے غفور ہوٹل پہونچتا ہوں۔ اور پھر دفتر!! ———

وہ نئے مہینے کی چھ تاریخ تھی ——— میں نے دنیش سے بیس روپے قرض لئے تھے ——— میری قمیص دفتر میں ہی اپنی خستگی کا از خود فاش کر چکی تھی اور میں آج لشتم پشتم ساری ریڈی میڈ کی فٹ پاتھی دکانوں کو ٹٹولنے والی پسندیدگی اور ناپسندیدگی کی نظروں سے دیکھ رہا تھا جب ہی میری نظریں اس کی طرف اٹھ گئیں۔

وہ بتیس اور چالیس کے قریب کی تھی اس نے ابھرتی ہوئی چہرے کی لکیروں پہ "افغان" یا "تبلا ذا" جیسا اسنو لگا کر ٹیلکم پاؤڈر جیسی تہیں جمائی تھیں۔ دو روپے والی "بجے پنجابہ" جیسی لپسٹک سے اس کے سکڑے ہوئے ہونٹ سرخ تھے۔ لال رنگ کی بندی پہ اس نے کم کم چپکا رکھا تھا۔ اس کی ساڑی بہت ہی پتلے نایلکس کی تھی جس کی پرنٹ کے تمام رنگ چیخ چیخ کر پکار رہے تھے۔ میچنگ بلاؤز کے اندر اس نے تین چار روپے

والا سلائیوں سے بھرا تنگ 'برا' پہن رکھا تھا کیونکہ "بقیہ" کمرے اوپر دونوں کے اندر دو مقام سے نیچے نمایاں تھا ـــــ میں بری طرح چونکا تھا۔ کیوں کہ اس نے کار سے اترنے والے بہت ہی موٹے سے دھوتی والے سیٹھ جی کو آنکھ ماری تھی اور سیٹھ جی نے توند سہلاتے ہوئے، میرے قریب سے گزرتے ہوئے سرگوشیوں میں اس سے پوچھا تھا۔

"گانا بجانا جانتی ہے کیا؟" ــــ

"ہیں حضور!" ــــ

اور سیٹھ جی اس کی طرف حقارت آمیز نظریں ڈال کر بہت تیزی سے آگے بڑھ گئے۔ جیسے کوئی بات ہی نہ ہوئی ہو۔ میں تو اسی بازار کا آدمی ہوں۔ اس لئے میں نے سب دیکھ لیا تھا۔ سب سن لیا تھا ــــ میں بہت ہی بچ کر آہستہ آہستہ اس کے تعاقب میں چل دیا! ــــ

موڑ کے پاس قصداً وہ ایک آدمی سے ٹکرائی تھی۔ اور دبی زبان سے کچھ کہا تھا ــــ اس آدمی نے اس کی طرف گھور کر دیکھا اور "سوری" کہکر چل دیا۔ وہ پھر عقابی نظروں سے ادھر ادھر دیکھنے لگی ــــ پان کی دوکان سے ہٹنے والے دونوں نوجوانوں کے درمیان وہ جان کر اور بظاہر بے خیالی میں چل رہی تھی اچانک اس نے کہا تھا ــــ

"مجھے یہاں سے کافی دور جانا ہے۔ آپ پہونچا دیں گے؟"

ان دونوں نے حیرت سے اسے دیکھا۔ پھر مکاری سے مسکرائے۔

"ہم دو ہیں ــــ اور میرے پاس صرف دس روپے ہیں"

وہ شخص چالیس پینتالیس کا رہا ہوگا۔ چہرے سے ایسی یتیمی نمایاں تھی۔ جو ماں باپ کی زندگی میں ہی ان کی بے توجہی اور ڈانٹ پھٹکار کا عطیہ ہوتی ہے وہ تیز تیز چلتی ہوئی اس کے برابر پہونچ گئی ــــ

"آپ کو شاید میں نے پہلے بھی کہیں دیکھا ہے؟" ــــ

وہ آدمی تھوڑی خجالت، کچھ فخر اور کچھ نروسنیس کے ساتھ مسکرایا۔

"چلئے کہیں چل کر جاتے ہیں"

"مگر!" ــــ

"آ بیٹے تو!"

اور میرے دیکھتے دیکھتے وہ قریب کے کیبن والے چائے خانے میں گھس گئے۔ میں پاس کی پان کی دوکان میں پان کھانے کے بہانے آئینہ دیکھتا رہا۔ اور وہ دو بھاری سنتا رہا۔ اچانک آئینے میں ان دونوں کا عکس ابھرا اور میں دوکان کے کاؤنٹر پر پندرہ پیسے ڈال کر ذرا آگے بڑھ آیا۔ مرد نے جھنجلاتی آواز میں کہا۔

"میں نے کہا نا —— میں ایک شریف آدمی ہوں۔ میری بیوی کو لیبر پین ہے وہ ہاسپٹل میں ہے۔" ——

"لیکن —— میں نے زیادہ تو نہیں ...." —— اس کی آواز دم توڑتے ہوئے مریض کی طرح اٹک اٹک کر نکل رہی تھی۔

"بھاگتی ہو —— یا شور کردوں" ——

"سالا —— بزدل" ——

وہ پھر آگے بڑھ گئی —— میں اس کے تعاقب میں تھا۔ وہ ایک ریڈی میڈ کی چھوٹی سی دوکان کو بند کرتے ہوئے سردار جی کے پاس آ کھڑی ہوئی۔ پتہ نہیں اس کے دستِ سوال کا انداز کیا تھا —— کیونکہ میرے قریب پہونچتے پہونچتے سردار جی کہہ رہا تھا۔

"بائی جی —— تمہاری جیسی میری ماں ہے"——

دوکان بند ہو رہی تھی اپنے وہاں ہونے کا جواز دیتے ہوئے کہا

"سردار جی —— میرے ناپ کی سوتی شرٹ ہے؟"

"ہے تو باؤجی —— مگر کل آنا" —— اور سردار جی جو شاید گھبرایا ہوا تھا یا اسے بھوک لگی تھی، یا کہ وہ ڈر رہا تھا، خلاف توقع مجھے قمیص دکھائے بغیر تالا بند کر کے چل دیا۔

اب میں تھا اور میرے سامنے وہ تھی —— اچانک میں نے کہا تھا ——

"آپ میرے ساتھ آئیے"

اس نے مجھے سر سے پاؤں تک دیکھا۔ خوشی کی لہر اس کے چہرے پہ ملتجی ہوتی پاجش کی تیلی کی طرح ابھری اور بجھ گئی —— وہ میرے ساتھ ساتھ میرے گھر تک آئی۔ میں نے تالا کھولا —— بھیس پاور کا بلب جلایا۔ بستر کی چادر جھاڑی اور کہا بیٹھئے! میرے یہاں آنے کا مقصد غلط نہ سمجھئے۔ مجھ سے آپ کی بے لبی

دیکھی نہ گئی۔"

"تو ـــــ تو ـــــ کسٹمر نہیں بنی گے ـــــ پھر مجھے کیوں لائے؟"

"دیکھئے ـــــ میرے پاس ادھار کے صرف پچیس روپے ہیں ـــــ اور یہ میری قمیص دیکھ رہی ہیں؟ ـــــ گھسی ہوئی تھی آج ہی پھٹ گئی۔" ـــــ مجھے نئی قمیص لینی ہے ـــــ میں آپ کو کیا دوں؟"

اس نے خوف زدہ اور مایوس ہو کر میری طرف دیکھا۔ پھر میرے نزدیک آکر میری قمیص کے بٹن کھولنے لگی ـــــ یہاں تک کہ میری پھٹی ہوئی قمیص اس کے ہاتھوں میں تھی۔

"اسے میں سی دوں گی!" ـــــ

"لیکن یہ تو! ـــــ"

"میں عورت ہوں ـــــ میں جانتی ہوں، کون سا ٹانکہ پھٹے ہوئے کو چھپا سکتا ہے ـــــ"

اور میرے کچھ کہنے سے قبل وہ سوئچ آف کر چکی تھی۔ مجھے اس کی بے بسی اپنے "اشو ٹیٹک" کی کھٹ کھٹ سے کہیں زیادہ کربناک محسوس ہوئی ـــــ ایک لمحے کو ایک خیال میرے ذہن میں ابھرا ـــــ جیسے ماچس کی تیلی کی رگڑ سے روشنی ابھرتی ہے ـــــ"

"میں اسے ہمیشہ کیلئے پناہ دے دوں تو! ـــــ یہ محفوظ ہو جائے گی ـــــ غفور کے ہوٹل سے نجات ـــــ اور گھر ـــــ"

لیکن تیلی تو ایک لمحہ بھی نہیں جلی، بجھی تیلی کے بعد اندھیرا دوگنا ہوتا ہے اور اندھیرے کے بعد وہ بلب جلا کر میری پھٹی قمیص سی رہی تھی۔ جیسے برسہا برس سے ایک گھریلو عورت مردوں کی پھٹی ہوئی قمیص سیتی ہے۔

میرے ذہن نے سوچا ـــــ

تیرا اور اس کا رشتہ کتنا گہرا ہے ـــــ ضرورت اور ضرورت۔"

میں نے پچیس روپے نکال کر اس کے حوالے کر دئے۔ اس کی آنکھوں میں ایک لمحے کو ماچس کا شعلہ ابھرا ـــــ پھر بجھ گیا ـــــ اور بجھی ہوئی تیلی میں نے گھر کے باہر پھینک دی!!"

دُھند کی دیوار

میرے شعور نے جس گھر میں آنکھیں کھولیں وہ عجیب سا گھر تھا۔ ویسے تو اسے بہت خوبصورت بنگلہ کہا جا سکتا تھا۔ جس کے پورٹیکو میں امپورٹیڈ کار کھڑی رہا کرتی، اور ابا کی آہٹ سن کر ہی ڈرائیور پچھلا گیٹ کھول کر مہذب انداز سے سر کو جھکا دیا کرتا۔ سیڑھیوں تک پہ دبیز قالین، قیمتی پینٹنگز اور ساری دنیا کی نادر چیزوں سے آراستہ ڈرائنگ روم بیڈ روم، ڈائننگ روم، گیسٹ روم، مشینری سے چلنے والا کچن، گیس کی بہتات کپڑے دھونے، صفائی کرنے، مسالہ پیسنے تک کی مشین یہ سب کچھ تھا لیکن یہ شاید گھر نہیں تھا کیونکہ یہاں کچھ ایسا سوفوکیشن تھا کہ دم گھٹتا ہوا محسوس ہوتا۔ اسی لئے جہاں جا کے میری نگاہیں سوالیہ نشان کی طرح آویزاں ہو جاتی وہ تھے امی اور ابا کے چہرے۔

گھر کی آسائشوں کی تہ میں عجیب سا کرب چھپا تھا جیسے کسی نے ادھیڑ عمری کو چھپانے کیلئے گہرا میک اپ کر رکھا ہو۔ امی ہلکے گھیر کی شلوار اور ڈھیلا جمپر پہنتی۔ اس کے باوجود جب وہ مارکٹنگ کرنے جاتیں

ایک قیمتی ساری ضرور خرید لاتیں۔ اسے سارے گھر کو دکھاتی پھرتیں۔ پھر بہت احتیاط سے تہ کر کے بکس میں ڈال دیتیں۔ پھر کبھی نہیں پہنتیں۔ شلوار جمپر ہی ان کا لباس تھا۔ لیکن اس سلسلے میں بھی ان کا حافظہ یا رویہ عجیب سا تھا۔ وہ اپنی بے حد قیمتی شلوار اور قمیص کو بھی اکثر کہیں رکھ کر یوں بھول جاتیں کہ ان کے کپڑے چوہوں کی خوراک بن جاتے۔ ایک طرف فضول خرچی کے ساتھ وہ حفاظت، تو دوسری طرف ایسی بے توجہی جیسے یہ پہنے جانے والا لباس اس دشمن کی طرح ہو جس کے سامنے سے انتقام لینا ان کے بس کا نہ ہو۔

ابا بھی کم و بیش ایسے ہی complicated تھے خود تو بہت ہی دیندار اور با اصول تھے لیکن مجھے انھوں نے بہت آزادی دے رکھی تھی۔ تعلیم و تربیت اور سخت تنگ داری کے باوجود مجھے ایسی آسائش زندگی دی تھی جو انھیں کے مطابق دور طالب علمی کے لئے غلط تھا۔ دیگر بھائی بہنوں کے ساتھ بھی ان کا رویہ کم و بیش یہی تھا۔ وہ بیحد کم گو اور کم آمیز تھے۔ امی کے ساتھ بھی ان کی بہت کم باتیں ہوتیں۔ بس وہ تھے ان کے دفتر کے کام اور ان کے پڑھنے اور عبادت کرنے کا معمول۔ ہاں اگر کسی موضوع پہ کبھی مہینوں بعد ان کی کھل کر بات چیت ہوتی تو وہ تھا ان کا ہندوستان!۔

ہند کی سرزمین پتہ نہیں کیسی تھی؟ لیکن وہاں کی فصلوں کی ہریالی میں ان دونوں کی مقدس آنکھوں میں دیکھا کرتا۔ کسانوں کے گیت ان کے لبوں پر بغیر الفاظ کے تھرتھرایا کرتے۔ پچھے آنگن میں کھجور کی چٹائی پر ایک ساتھ مل کر کھائی جانے والی بیسنی روٹی کا ذکر، شام کو مکئی کے بھونے کا سوندھا پن گنے کے دنوں کی رسیاؤں۔ نئے مٹر کی قبولی۔ والان کی گپ شپ سے ہوتے ہوئے یہ ذکر شہر کے اجالوں تک جا پہونچتا۔ وہ معیاری اسکول جہاں مختلف قوم و مذہب کے بچے بھائیوں کی طرح پڑھتے۔ ہوم ورک میں ایک دوسرے کی مدد کرتے۔ چھپ چھپ کر درختوں سے پکے جامن گراتے۔ ریزلٹ کے دن بھاگ کر چھ آنے میں سینما دیکھنے اور چپکے سے آنگن کی دہلیز پار کر کے برآمدے کی جھلنگی چارپائی پر ایک چادر لپیٹ کر سو رہتے۔ کالج کا وہ ہنگامی دور، جلوس میں شریک ہونا۔ اشتعال آمیز تقریریں کرنا۔ ریلوے لائن اکھاڑنا۔ مشعل جلوس کے ساتھ میلوں پیدل چلنا۔

میں یہ سارا ذکر بڑی دلچسپی اور غور سے سنا کرتا جیسے کسی مقدس تذکرے پر تاریخی چہار دیواریاں کھڑی کر دی گئی ہوں۔ ابا اور امی کے چہرے فخر اور غرور سے تمتما اٹھتے۔ اداس اور سنجیدہ چہروں کے سانولے پن میں خون کی تیز روی کی سرخی مل کر عجیب سا رنگ بھر دیتی۔ اور میں اس چوڑ نخے چولہے کا تصور کرنے لگتا جس کے اوپر دھان ابالنے کے مٹکے رکھے ہوں اور کام والیاں ارہر کے کھڑ جھونک رہی ہوں۔ اس گہری سرخ آگ کی ہلکی ہلکی لپٹ اور فیوچر کی جگمگاہٹ سے لبریز چہرے ایسے ہی ہوا کرتے ہوں گے۔

میرے والدین کے پاس یہی ایک موضوع تھا جو شاید مشترک، قابلِ ذکر اور حال کی حد بندیوں کو توڑ کر بہت دور بہا لے جانے والا تھا ــــــ دور ــــــ دور تک حال کی مخملی زندگی کی نرمی کا پتہ نہ ہوتا۔ بلکہ بیتے دنوں کی ہری ہری گھاس پہ ان کا ذہن دوڑتا رہتا ــــ ایک ایک لمحے کا ذکر وہ اس قدر تقدس سے کرتے جیسے دلوں کیلئے سجدہ گاہ ہو وہ سب کچھ ــــــ ایک ایک فرد کو انھوں نے اپنے اندر اس طرح محفوظ کر رکھا تھا کہ میں بھی انھیں باطنی طور پر پہچاننے لگا تھا۔ افطار کی رکابی لئے کلی دار پیوند لگے پاجامے اور کمر تک کی مغزی والی کرتی پہنے ململ کا پاٹ دار دوپٹہ اوڑھے لبچی کی ابواؤں اور خالاؤں کی سرِ شام کی قطاریں۔ عید کی گہما گہمی۔ ہر گھر کی دہلیز کے اندر عورتوں کا مل کر کپڑے چھاپنا۔ سریش لگانے کی جلدی اور گلدستہ بٹھانے کی کھٹ پٹ۔ دوپٹے میں لچکے اور چٹکیاں ٹانکنے کی مہم۔ عید سے پہلے باری باری سے ابا کا دوستوں سے مل کر سوئیوں کے کل چلانا۔ کرتے کی بیل کی کڑھائی پسند کرنے کے لئے دوکان دوکان گھومنا۔ خوبصورت کارڈ خرید کر دوستوں کو پوسٹ کرنا یہ ساری باتیں ہوا کرتیں اور میں سُنا کرتا۔

بچپن سے ہی یہ سب کچھ میں نے اتنی مرتبہ اور ایسے انہماک سے سنا تھا کہ میں اب خود کو بھی اس پس منظر میں شریک محسوس کرنے لگا تھا پھر جیسے جیسے میں بڑا ہوتا گیا میں نے محسوس کیا جیسے یہ کرتے کرتے وہ لوگ اچانک چپ ہو جاتے ہیں۔ جیسے ڈر گئے ہوں۔ جیسے ماضی کے گلزار میں کسی نے آگ لگا دی ہو۔ ان کے چہروں کی ہولناک خاموشی مجھے بچپن سے ہی بہت بے چین

کر دیا کرتی تھی۔ آہستہ آہستہ یہ بے چینی بڑھنے لگی تھی۔ اور دفعہ میں پوچھ بیٹھا تھا۔
"پھر ابا؟ —— ادھر کو کیوں آگئے؟"
ابا میرے لہجے پہ یوں چونکے تھے جیسے انھیں کرنٹ چھو گیا ہو۔ شاید میرا لب و لہجہ میرا انداز ان سے ان کے بچپن سے ان کے ماضی سے الگ تھا۔ میرا سوال شاید گہرے نشتر کے وار کی طرح انھیں کاٹ گیا تھا۔ دیٹ ڈیز آر گون۔ اینڈ گون فار ایور۔

That days are gone and gone for ever

وہ یکلخت خاموش ہو جاتے۔ اور پائپ بھرنے لگتے۔ امی کچھ جذباتی ہو کر آبدیدہ ہو جاتیں اور بھرائی ہوئی آواز میں رک رک کر بولتیں۔
"لوگوں نے ہمارے گھروں کو جلا دیا بیٹے۔ ہم جان بچا کر بھاگ آئے تمہارے آنے والے دنوں کے لئے"
"پھر امی؟ ——"
"یہاں اپنا کچھ بھی نہیں تھا۔ کچھ بھی نہیں رہا۔ زندگی نے ہمیں اتنی فراوانی اور اتنی آسائش دی کہ ہم گھر بھول جاؤں مگر گھر کون بھولتا ہے؟ —— آنگن میں کوؤں کے بولنے کی معنویت۔ مرغی کے ڈربے سے صبح سویرے سب سے زیادہ انڈے نکالنے کی فکر۔ اور دیر سے ابا کے آنے کے بعد نظریں بچا کر وضو کرنے کی جلدی کوئی بھول سکتا ہے؟ —— ان کی آواز دھیرے دھیرے ڈوبنے لگتی جیسے خواب میں باتیں کر رہی ہوں کہ ابا گھبرا کے ٹوک دیتے۔
"اے چپ بھی کرنا —— کیا فضول لگا رکھی ہے۔ سو جاؤ" —— پھر مجھے کہتے۔
"چلو —— سو جاؤ —— ورنہ صبح ایکسرسائز ٹرپ مس کر دو گے۔ چلو ——"
اور جیسے وہ دونوں حال کی ان تختوں پر بے چینی سے کروٹیں بدلنے لگتے جس پر کانٹے ہی کانٹے ہوں اس لئے تخل کی اس تہ سے کانٹے چن دینے کا ارادہ میرے شعور میں پلتا رہا۔
زندگی نے، حالات نے اور ابا کی فراخ دلی نے مجھے بے حد موڈرنائزڈ کر دیا تھا۔ موسیقی کی دھن پر رقص، ہپی اسٹائل گفتگو، ٹی وی پر

پروگریس دینا، ان گنت گرلس فرینڈس کو تحفے بھیجنا، ان کے ساتھ شامیں گزارنا، اور چوری چھپے کسی کے ساتھ رات کے چند گھنٹے گزار لینا عام سی بات تھی۔ بہت ہی عام ــــ جیسے اس طبقے کی آسائشوں کا خراج ــــ جیسے میرے طبقے کے میری عمر کے دیگر افراد تھے، ویسا ہی میں بھی تھا ــ یوں بھی میں نے تعلیم کی اتنی سیڑھیاں طے کر لی تھیں کہ جب چاہتا بغیر گھنٹی دبائے محض آواز دے کر اچھی ملازمت کو خوش آمدید کہنے کیلئے پکار سکتا تھا۔ لیکن میں شاید اتنا اسٹریٹ فارورڈ Straight Forward اور پلین اینڈ سمپل نہیں ۔ یہ مجھے پتہ تھا۔ دراصل میرے اندر گرہ سی تھی ۔ ابا جو اس قدر مذہبی اور ریزرو تھے۔ وہ مجھے ٹوکتے کیوں نہیں ــــ میں ان کے پیارے ماضی سے کس قدر دور ہو چکا ہوں۔ کیا اپنے ذہن کی وراثت کے تحفظ کا جذبہ انھوں نے مٹا ڈالا ہے ــــ؟ وہ سرزمین جسے وہ اتنے برس تک نہیں بھول سکے انھیں پکارتی کیوں نہیں ؟ اتنے سارے عزیز جوان کے وہاں ہیں کیا وہ ان سے ملنے کیلئے بھی پاسپورٹ نہیں بنوا سکتے ؟ کیا انھیں پتہ نہیں آج کل ویزا کی کتنی آسانیاں ہیں ؟ ــــ ایک دفعہ میں نے کہا بھی ــــ

" ابا ! ــــ ایک بار انڈیا چلیں ــــ میں اپنا آبائی گھر دیکھنا چاہتا ہوں " مگر انھوں نے بڑی بے رخی سے جواب دیا تھا ــــ"

"تم پاسپورٹ بنوالو ـ مجھے نہیں جانا ہے "

میں حیرت سے پھٹی نظریں لئے ان کے اور امی کے چہروں کو دیکھنے لگا۔ امی دراصل سہم کے چپ ہو گئی تھیں۔ لیکن ان کے چہرے پہ ان کہے الفاظ کا خیال سا ابھر آیا تھا۔ کئی روز عجیب سی خاموشی رہی۔ پھر میں نے دیکھا، امی بار بار ابا کو سمجھانے کی کوششیں کر رہی ہیں۔ اپنے رشتہ داروں کے خطوط کے اداس لفظوں کا دے رہی ہیں۔ مگر ابا کے چہرے کی کرختگی اور خاموشی نمایاں ہو گئی ہے کہ ان کا کوئی بھی لفظ ابا تک پہونچ نہیں پایا۔ بلکہ مستقل چہار دیواری کے پتھروں سے امی کے ملائم دل پہ ابابیل کی کنکریوں کی بارش سی کر رہا تھا ــــ اور میں نے گھر آکر پاسپورٹ کی دوڑ دھوپ شروع کر دی۔ سال بھر کے اندر اندر ویزا بھی مل گیا۔

میں نے سمجھا تھا۔ ویزا مل جانے کے بعد ابا کے اندر کا یہ سناٹا ضرور

ٹوٹ جائے گا۔ وہ اپنے دوستوں اور عزیزوں کے تحفے اور یادوں کے ٹکڑے کے بوجھ سے مجھے لدا پھندا کر دیں گے نہ جانے کیا کچھ؟ ـــــ مگر جیسے جیسے میری روانگی قریب آتی گئی حیرت کا اندھیرا مجھ پر یلغار کرتا گیا ـــــ ابا ویسے ہی بھے روٹینڈ اور بااصول۔ ذرا بھی بے ترتیبی نہیں۔۔ نہ اندر کی نہ باہر کی۔ جیسے میں کراچی جا رہا ہوں۔ جیسے یہ لاہور کا ایجوکیشنل ٹرپ ہو ـــــ بے حد عام سی بات۔ ہاں! امی بدحواس بدحواس سے ہوئی جا رہی تھیں۔ فلاں آپا کی لڑکیوں کے کپڑے فلاں کی بھانجی کے لئے چوڑیاں۔ فلاں کے بچوں کے کھلونے۔ فلاں اور فلاں۔

وہ میری روانگی کے ایک دن پہلے کی رات تھی۔ میں اپنی نئی دوست دیبا کا خط پڑھ رہا تھا کہ اچانک میرے تحت الشعور کا چھپا ہوا چور اچانک سامنے آ گیا!

"ہندوستانی لڑکیاں" ـــــ بچپن سے سنی ہوئی ساری باتیں، میرے ذہن پر دھندلی تصویروں کی طرح متحرک ہونے لگیں۔ اور ان دھندلکوں سے ان کی ان دیکھی شبیہ جھانک کر مجھے از حد بے چین کرنے لگی، سادہ لوح اور خواب ناک ـــــ لمبے گھنیرے بالوں میں بیلے کے گجرے لگانے والی وہ حسینائیں جن کے کانوں کی لویں بھی بیلے کے پھولوں سے مہکا کرتی ہیں ـــــ ساون کی گھٹائیں دیکھ کر دوپٹے رنگنے، ہری چوڑیاں پہننے اور مہندی سے ہتھیلی پہ نقش و نگار بنانے والی شہزادیاں کیسی ہوں گی؟ ـــــ

میں نے کہانیوں میں پڑھا تھا، دوستوں سے سنا تھا، ان لڑکیوں کی شادیوں میں بڑی دشواریاں ہوتی ہیں۔ لڑکے بکتے ہیں لڑکیاں انتظار کے پٹ تھامے آتی جاتی بہاروں کو دیکھ کر بڑے دردناک نغمے الاپتی ہیں۔۔ اپنے رشتے کے بھائیوں سے انھیں ایک پیدائشی رومانی لگاؤ ہوتا ہے حالات کی تیز دھوپ ان کے خوابوں کے لامحالہ اسی سائبان تلے پناہ لینے پر مجبور کر دیتی ہیں ـــــ بعض تو اکثر بغیر جان پہچان کے ہی! اپنے بھائیوں کے لئے رومال اور تکیے کے غلاف بنا بنا کر بھیجتی ہیں۔ ان کے چھوٹے بھائی غزل کے روایتی قاصد ہوا کرتے ہیں۔ ـــــ

اور میں بڑی حیرت آمیز خوشی کے ساتھ اس سرزمین کے لئے بے چین بے چین سا تھا۔ "لیکن کیوں"؟ ـــــ اس کا اعتراف میرے

اندر نہ تھا۔ کیوں کہ میں بہرحال ابا کی شرافت اور بلندی کردار کا امین خود کو سمجھنے پر مجبور تھا۔ ویسے تو میری بہت سی لڑکیاں دوست تھیں۔ میں جنہیں بے تکلفی سے مخاطب کیا کرتا۔ ہاتھ کی لکیروں کو دیکھتے ہوئے ان کے ہاتھ دبا دیتا چہل قدمی کرتے ہوئے کمر میں ہاتھ ڈال دیتا۔ اور کبھی ....

واقعی میرے لئے انجانا کیا تھا؟ —— مگر پھر بھی میں شدت سے منتظر تھا۔ دوسرے دن میں سامان سے لدا پھندا لاہور سے سوار ہوا۔ اسٹیشن پر گاڑی بدلی۔ پھر بارڈر کراس کیا۔ اور اس کے بعد میں کھڑکی سے باہر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا۔ جیسے میں اس خوابناک سرزمین کا انگ انگ اپنے اندر محفوظ کر لینا چاہتا تھا۔ کیا یہی ہندوستان ہے؟ —— سب کچھ تو ویسا ہی تھا، ویسی ہی دھرتی، ویسے ہی لوگ صرف پگڑ والے سکھوں کو دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی۔ کئی ایک میرے ہی ڈبے میں سوار ہوئے —— میں حیرت اور پوشیدہ خوف کے تحت ان سے گفتگو کرنے لگا۔ لیکن وہ سب کے سب بہت ہی سادہ اور مخلص تھے۔ میں حیرت زدہ تھا۔ ابا کے خوابوں کا ملک یہی ہے؟ —— لوگ تیزی کیا تھ کھڑکیوں سے سامان اندر پھینک رہے تھے۔ میں اس طوفانی کیفیت بغور دیکھ رہا تھا۔ اگر یہ بدتمیزی ہے تو جلد بازی بھی۔ اگر یہ سادگی ہے تو سچائی بھی —— ٹرین آگے بڑھتی رہی، فاصلہ طے ہوتا رہا —— دھیرے دھیرے میں بھی دھوتی اور ساڑی کا، اس طرز حیات کا عادی ہو چلا تھا۔ جیسے میں بھی انھیں میں سے ہوں —— اور ایک خیال میرے اندر ابھرا —— گویا انڈیا میں اپنا لینے کی بہت بڑی قوت پوشیدہ ہے —— اور مجھے ریحانہ کے الفاظ یاد آئے جس نے میرے جانے کا ذکر سن کر کہا تھا ——

"انڈیا سے ٹھیک طریقے سے لوٹ آنا —— وہاں کی لڑکیاں ساحرہ ہوتی ہیں۔ سنتے ہیں بغیر کچھ کہے سنے محض نظروں کے سحر سے بس میں کر لیتی ہیں" ——

"کیا واقعی؟" —— دل کے اندر چھپے ہوئے احساس نے سر ابھارا اور میں بظاہر باہر کے نظارے دیکھتا رہا —— ہر طرف سبزہ ہی سبزہ تھا —— ہرے بھرے درخت، کنوؤں سے پانی بھرنے والی عورتیں، ہل

چلاتے ہوئے کسان، تالاب میں بنسی ڈالے ہوئے کنارے کنارے بیٹھے ہوئے زنگ دھڑ رنگ کالے کالے بچے ــــــ

"پیج"! انتظار یہاں کی مٹی میں ہے۔ یہاں سبھی انتظار کرتے ہیں۔ مرد، عورت، بچے، اور لڑکیاں ــــــ اسی لئے ان کا انتظار اتنا جان لیوا ہوتا ہے۔ ــــــ

کئی اسٹیشن آئے گاڑی بدل گئی اور دیکھتے دیکھتے، دوسری ہی صبح میں اپنی خالہ کے دروازے پہ تھا ــــــ ایک عمر رسیدہ شفیق چہرے نے مجھے خوش آمدید کہا بلکہ مجھے دیکھ کر ان کی آنکھیں چھلک آئیں۔ انھوں نے بڑی شفقت کے ساتھ میرے سر پر ہاتھ رکھا۔ پھر مجھے منہ ہاتھ دھونے کو کہا ــــــ اور انھوں نے کسی کو پکارا ــــــ

"شنّو ــــــ پاکستان سے آیا کا بیٹا آیا ہے غسل خانہ ٹھیک کر دو!" ــــــ

شیشے کی چوڑیوں کی کھنک کے ساتھ مجھے مدھم سی ہنسی کی آواز سنائی دی۔ میں متجسّس نظروں سے کھادی کے موٹے پردے کو دیکھنے لگا جس کے پیچھے ایک پرچھائیں کے ہلنے اور دھب دھب چلنے کی آواز تھی۔ میں نے غسل کیا ــــــ اور میرے کنگھی کرتے کرتے پیلے رنگ کا چھپا ہوا دسترخوان بچھا دیا گیا جس کے چاروں طرف تک بندی کے اشعار پرنٹ تھے۔ رکابیاں اور پیالے بنے ہوئے تھے ــــــ پھر شنّو نے ناشتہ لگانا شروع کیا۔ میرے سامنے تلے ہوئے پراٹھے۔ گرم کیا ہوا حلوہ۔ اور تلے ہوئے کباب کے ٹکڑے۔ لیکن میری نظریں شنّو کے نفیس ہاتھوں کو بغور دیکھ رہی تھیں۔ جن پر محنت کی تھکن اور آٹے کی خشکی کے باوجود ایک عجیب سی دلکشی تھی ــــــ وہ گلابی چارجٹ کے دوپٹے سے سر ڈھکے ہوئے تھی ــــــ اس کی بڑی بڑی غلافی آنکھیں مسلسل نیچے دیکھ رہی تھیں۔ اس کے باوجود اس کے رخسار تمتما رہے تھے اور ہونٹوں پر بڑی ہی شوخ سی مسکراہٹ تھی۔ خالہ امی نے تعارف کرایا ــــــ

"یہ شنّو ہے ــــــ اسی سال میٹرک پاس کیا ہے، داخلہ لینے کو کہہ رہی ہے" ــــــ

"ہیلو!" ــــــ میں نے قصداً بے تکلفی سے کہا ــــــ اور وہ میری طرف

دیکھ کر بُری طرح جھینپ گئی۔

"معاملہ چل سکتا ہے" ـــــ اس مخصوص ماحول کے پروردہ اجنبی نوجوان نے میرے اندر سے مخاطب کر کے مجھے کہا۔ جیسے میں یہاں کے مقدس جالوں میں پھنسنے سے قاصر تھا!۔

یہاں کی ایک ایک چیز کو میں نے غور سے دیکھا۔ چولہا جلا کر گھنٹوں دھوئیں بھرے کمرے میں بیٹھ کر پنکھیا جھلنا ـــــ اور کہاں وہ گیس کی الیکٹرک جیسی وال فٹنگ۔ صبح سویرے اٹھ کر سارے گھر کی صفائی اور کہاں وہ مشینی جھاڑو۔ لکڑی کے پڑھے پہ بیٹھ کر گھنٹوں عجیب سی محویت کے ساتھ باورچی خانے کے کام کرنا۔ پٹ پٹ کر کپڑے دھونا۔ بستر کی ایک ایک شکن برابر کرنا۔ اور دوپہر کے وقت گھنٹوں بیٹھ کر پوری فراخ دلی کے ساتھ دنیا بھر کی باتیں کرنا۔ پھر شام سے ہی باورچی خانے میں یوں مصروف ہو جانا کہ محسوس بھی نہ ہو سکے کب شام ڈھلی اور کب بتیاں جل گئیں۔ رات گئے فارغ ہونا اور تھک کر سو جانے کے بجائے سبھوں کے بستروں کو پھر سے چیک کرنا۔ سرہانے میں پانی رکھنا۔ اوڑھنے کی چادر دینا۔ تکیہ ذرا سا کج ہو تو ٹھیک کر دینا۔

گویا یہ ہے ای اور ... کے خوابوں کا کھویا ہوا جزیرہ۔ جس کے چاروں طرف ایسے کالے سمندر کا پھیلا ہے کہ وہ یہاں تک آنے میں خوف محسوس کرتے ہیں۔ اندر سے بھی اور باہر سے بھی۔

شنو! ـــــ میری دلچسپی کا مرکز اس کی تہہ دار شخصیت بھی تھی۔ اسے دیکھ کر میری دوست لڑکیاں مجھے یاد آئیں۔ میں شنو سے گفتگو بھی کرتا اور بے تکلف ہونے کی کوشش بھی لیکن دوست بنانے کے اپنے تمام گر مجھے اتنے گھٹیا لگے کہ اپنے آپ سے ہی مجھے نفرت محسوس ہوئی۔ پھر بھی میں شنو سے دوستی کرنا چاہتا تھا۔ میرے اندر عجیب سی بے کلی تھی۔

"کیا مجھے روایتی عشق ہو گیا ہے؟" ـــــ میں اپنے آپ سے پوچھتا۔ اور میرا ذہن چپ تھا۔ واقعی ہندوستان ہی بحر ہے۔ میں سنے اعتراف آیا۔ رشتہ داروں اور عزیزوں سے، دوستوں کے جاؤں سے مگر میرا جی نہیں چاہتا کہ میں گھر سے باہر شہر دیکھنے بھی جاؤں۔ ایک گھریلو پن میرے اندر آ گیا تھا۔ گھر کے اندر

مجھے ایک عجیب سی طمانیت آمیز ٹھنڈک کا احساس ہوتا۔ پناہ گاہ کا گرم اور محفوظ تصور میں نے پہلی مرتبہ پہچانا تھا حالانکہ یہاں میرے شہر جیسا کچھ بھی نہ تھا۔ نہ کلب گھر کی رنگینیاں۔ نہ سینما کی گہما گہمی، نہ وی، سی، آر پر اسمگل شدہ فلمیں دیکھنا۔ نہ نت نیا اسٹائل۔ نہ راہ چلتی لڑکیوں کو "ہیلو" کہہ کر چھیڑنا۔ نہ مختلف بہانوں سے تحفے دیکر براہ راست اپوائنٹمنٹ سلیپ بھیجنا۔ کچھ بھی تو ویسا نہیں۔ عجیب مدھم آہستہ رو اور نرم سی زندگی۔ نہ منجمد نہ فاسٹ۔ پھر بھی اس زندگی میں کیسی سبک طبیعت ہے۔ میں سمجھ نہیں پاتا۔ اور دیرا کے دن ایک ایک کر کے ختم ہو رہے تھے کہ نیا سال آگیا۔ ہمارے یہاں تو امریکی ڈھنگ سے مبارکبادیاں دی جاتی ہیں مگر یہاں تو سالِ نو کی صبح بھی عام صبح جیسی تھی۔ یہاں بہت ہی ماڈرن اور دسٹرنائزر ہوئے تو "ہیپی نیو ایئر" کہہ دیا اور جواب میں گھسی گھسائی "سیم ٹو یو" سن لیا۔ تحفہ دینا۔ جشن منانا۔ اور کھوکھلی خوشیاں لٹانا اس طبقے میں معیوب تھا جہاں میں مہمان بنا تھا۔ عجیب بات تھی جو یہاں کا طبقہ اعلیٰ تھا۔ وہ وہاں کا درمیانہ طبقہ تھا۔ اور وہاں کا طبقۂ اعلیٰ یہاں کا درمیانہ سہما اور سمٹا ہوا طبقہ تھا۔ ہندوستان کے اس متوسط طبقہ کا جو سحر ہے اس کا توڑ کیا ہے؟ ——— وہ کون سا راز ہے؟ ——— ماورائی طاقت کہاں ہے؟ کس شئے میں ہے؟ میری سمجھ میں نہیں آتا۔

میں نے بھی شنو کو صبح ہی نئے سال کی مبارکباد دی مگر اس نے "سیم ٹو یو" کہنے کے بجائے زیر لب شکریہ کہا۔ اور پراسراری شرمیلی سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر رینگ گئی میں اپورچونسٹ ——— opportunist تھا میں شعوری طور پہ شنو کو تحفہ دینا چاہتا تھا ——— مگر کیا؟ ——— یہی فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا۔ اگر وہ میری دیگر دوستوں کی طرح ہوتی تو کاسمیٹکس سے لیکر رسٹ واچ تک کچھ بھی دے سکتا تھا۔ مگر یہاں تحفہ صرف تحفہ نہ تھا۔ سمبل تھا۔ بہت کچھ کہہ دینے کا۔ ایک واسطہ تھا، بغیر الفاظ کی وضاحت کا۔

اس کے حسن کی جذب کر لینے والی کیفیت کا احساس میں اسے دینا چاہتا تھا بہت سوچ کر میں نے ایک آئینہ خریدا ——— اس کے پیچھے اپنی ایک انلارج تصویر فریم میں لگوا دی اور اسے قیمتی گفٹ باکس میں پیک کر دیا کہ اسے بھجوا دیا۔ یہ کہہ کر ———

"نیا سال، ہر سال آیا کرے گا شنو - مگر میں کہاں - تم کہاں - یہ تحفہ ازلی اور ابدی ہے قبول کر لو" ——

پہلے تو اس نے وحشی ہرنی کی طرح مجھے دیکھا - پھر میرے الفاظ نے دو دھاری نشتر کی طرح اس کے اندر گہرا وار کر دیا جیسے —— اس نے تحفہ لے لیا اور واپس اپنے کمرے میں چلی گئی —— میں اس کا ردعمل جاننا چاہتا تھا - مگر وہ سمندر کی طرح شانت اور گہری تھی - ہر دن کی طرح اپنے معمولات میں مصروف ہو گئی - جیسے گہرے پانی کی سطح پر کنکری گری اور ڈوب گئی - میرا دل اور بھی تیزی کے ساتھ اس کی طرف کھنچنے لگا - اب ویزا کا صرف ایک مہینہ رہ گیا تھا —— کہ ایک شام میں نے دیکھا —— شنو اپنے کمرے میں اکیلی ہے خالہ امی کہیں گئی ہوئی تھیں —— اور وہی آئینہ اس کے ہاتھوں میں تھا —— نگر الٹا —— مجھے محسوس ہوا جیسے قارون کی دولت مجھے مل گئی ہو - اس اضطراری بے چینی کے تحت میں اس کے پاس گیا —— اور اسے بازوؤں سے تھام کر کھڑا کر لیا —— وہ کچھ یوں گھبرا گئی جیسے کسی نے ہر دار رخ کے جلتے ہوئے چولہے کو کسی نے مارچ کے مہینے میں ہوا دے دی ہو —— ایسی آگ سے کون بچ سکا ہے؟ —— یوں تو میرے لئے کچھ بھی انجانا - ان دیکھا اور خطرناک نہیں تھا - میں سمجھ رہا تھا وہ گھبرا کر رو دے گی - اس کی دودھیا پیشانی پر کچھ ایسے قطرے ابھر آئیں گے جنہیں خشک کرتے کرتے وہ کانپ کانپ اٹھے گی - خوف —— ڈر —— احساس گناہ اور ندامت کے بوجھ سے دبی ہوئی شنو میری تمنا کا اینٹی کلائمکس ہو گی - مگر یہ جو شنو میرے سامنے تھی - وہ شاید کوئی اور ہستی تھی - اس کے چہرے پر ندامت اور دکھ کی بجائے ایسا سکون اور یقین سا تھا جیسے وہ چاہت کے فلسفے کی مکمل تفسیر ہو —— اور میں ایک اجنبی لفظ کی طرح جس کے معنی حاشئے میں لکھے جاتے ہیں - محسوس ہو رہا تھا - وہ اپنی پراسرار اور پرسکون شخصیت سمیت مجھے اتنی بڑی نظر آئی جیسے وہ میری دھوپ کی پرچھائیں ہو - اور میں بونا سا ایک وجود —— میں خود ہی ڈر کر اور سہم کر رہ گیا —— میں نے اس سے ہر ہوس پرست کی طرح شادی وغیرہ کا وعدہ کرنا چاہا - مگر اس نے مجھے ایسی نظروں سے دیکھا جیسے کہہ رہی ہو ——

"من تو شدی" کا احساس انمول ہوتا ہے - اس کیلئے کسی جھوٹ کی میزان ضروری

نہیں ہوتی "______

اور میں خاموش رہ گیا لیکن میرا ذہن عجیب طرح کے احساس گناہ کی جکڑ بندیوں میں الجھ کر رہ گیا تھا۔ میں جانتا تھا۔ میری حرکت قطعی اضطراری اور جذبۂ اقتدار کے تحت تھی۔ جسے وہ عشق کی انتہا کا درجہ دے رہی تھی۔ وہ دراصل ہوس کا ایک رخ تھا ______ مجھے یہاں سے واپس جانا ہے ۔ اس جلدی میں یا اس کے بعد کبھی بھی میں واپس اس دلیش میں اس کی دنیا آباد کرنے نہیں آسکتا تھا۔ یہ داغ ہوس ہے جسے وہ زندگی بھر درد کی عرفانی ٹیس جیسی امانت سمجھتی رہے گی یا ممکن ہے یہی زخم ناسور بن کر پھوٹ نکلے۔ اور کئی نسلیں تعفن اور گھٹن کے مارے بے موت مرجائیں ______ میں کوئی اثباتی قدم اٹھانا چاہتا تھا۔ constructive ڈھنگ سے کچھ بھی کرنا چاہتا تھا لیکن کیسے ؟۔ اور جب ہی مجھے محسوس ہوا جیسے میری طاقتیں مفلوج ہو چکی ہیں۔ اباکی تربیت اور امی کی دولت احساس کے باوجود میرے اندر کچھ ایسا دھنواں سا ہے کہ میں اپنے اندر کی اور باہر کی ہر ایک شئے کو دیکھنے سے قاصر ہوں جیسے شنو سے جو بھی لگاؤ ہے اس کے مبہم معنی کے بوجھ سے میرا دم تو گھٹتا جارہا ہو۔ لیکن اس گھٹن سے آزاد نہیں ہو سکتا۔ جیسے میں اس سڑی ہوئی مچھلی کی طرح ہوں جس نے شفاف تالاب کو ناپاک کر دیا ہو۔

اچانک خیالات کے اس موڑ پر پہونچ کر مجھے ایک انتہائی آسودگی کا احساس ہوا ______ جیسے یہ آسودگی امی کی بے چینی اور ابا کے بجر د کا خراج ہو!۔

دوسری صبح ہی میں نے اچانک تھا مسے اپنا ڈیپارچر لے لیا۔ اور رکشے پہ سوار ہو گیا۔ یہ دیکھے بغیر کہ شنو کی آنکھوں سے ایسے قطرے ٹپک رہے ہیں جو کبھی سیپ تک پہونچ کر موتی نہیں بن سکتے۔

یہی میری طمانیت کی انتہا تھی!!! ______

چائے پانی

سامنے کی بیڈ پر جو مریض ہے، میں اسے پہچانتا ہوں۔
اس کے خاص لوگوں کو بھی شاید وہ پہچان میسر نہیں ہوگی جو مجھے ہے۔
نہ اسے اٹینڈ کرنے والی اس عورت کو جو غالباً اس کی بیوی ہے اور نہ ان سے
وزیٹرز کو جو اس کے لئے پھلوں کے پیکٹ اور پھولوں کے گلدستے لاتے ہیں
لیکن میری پہچان کا کوئی نقطہ نہیں۔ میرا اس سے کوئی رشتہ نہیں اور لیبل
کے اس عہد میں احساس ہی بے لیبل حقیقت ہے۔

بھیا! ———— الو نے پکارا ————

میں نے الو کا ہاتھ تھام لیا۔ تین سال سے میں ریٹائرڈ زندگی جی رہا ہوں۔
میرے پڑوسی الو کو، جو مجھے بھیا کہتا ہے، دل کا دورہ پڑا ہے۔ میں اسے
ہاسپٹل لے آیا ہوں۔ مگر یہ الو پہ کوئی احسان نہیں۔ مصروف زندگی اگر
یکبارگی خالی ہو جائے تو جھوٹے بہلاوے بھی سچ کے جامے پہن لیتے ہیں
ورنہ جگہ جگہ سے رشتوں اور لفظوں کے اس دور میں بھیا کی اہمیت کیا ہے؟
———— واقعی اگر سروس کے تین سال کے درمیان، کہیں الو میرا پڑوسی

ہوتا تو برسوں ساتھ رہنے کے باوجود، شاید میں اسے پہچانتا بھی نہیں!۔
مریض کی حالت تشویشناک ہے۔

جنرل ہاسپٹل میں سیریس کیس کے ساتھ جو گہما گہمی ہوتی ہے، وہ اس کے گرد دائرہ سا بنا رہی ہے۔

اسٹینڈنٹ عورت یعنی اس کی بیوی گھبرائی گھبرائی سی اپنے ہاتھی نما جسم کو ہاف وائل کی ساری میں لپیٹے ادھر ادھر پھر رہی ہے۔ ڈاکٹری خانہ پری ہر پانچ منٹ کے بعد کی جا رہی ہے۔ اس کو دیکھنے کے لئے آنے والوں کا تانتا بندھا ہوا ہے۔ بھی سہمے سہمے سے ایک طرف کھڑے آنکھیں پھاڑے یوں اس کے چہرے کو دیکھ رہے ہیں جیسے اچانک اخبار کی ہیڈ لائن میں کسی طوفان، کسی فساد، کسی خطرے کی خبر آ گئی ہو۔

اس عورت کی نظریں معاً الونے کے سرہانے رکھے ہوئے سلیٹی رنگ کے اسپتال والے سرکاری ریک پر ٹک گئی ہیں جس کے نچلے در پر صراحی رکھی ہے۔ اور اوپری در پر اسٹیل کا شفاف گلاس ہے۔ میری نظریں ملتی ہیں شاید اسے ہمدردی کی جھلک نظر آئی۔ وہ میری طرف چلی آئی۔

"پانی چاہئے کیا؟" ——— میں نے مہذب انداز سے پوچھا۔

"ہاں ——— بھائی صاحب۔"

میں نے گلاس اس کی طرف بڑھا دیا۔

وہ پانی انڈیل کر پیتے ہوئے گلاس کو بغور دیکھے جا رہی تھی۔ شاید آئینہ نما اسٹیل میں مانگ کی سرخی دیکھ کر اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئی تھیں۔

"بڑا بابو کب سے بیمار ہیں؟" ——— میں نے از راہ ہمدردی پوچھا ———

"دوسرا دورہ ہے بھیا۔" ———

"پہلا کب ہوا تھا؟" ———

"چھ مہینے پہلے ——— مگر انھوں نے نہ تو آرام کیا اور نہ پرہیز!" ———

"پرہیز!" ——— میرے ہونٹوں پر تلخ طنزیہ سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

"بڑا بابو لوگ پرہیز نہیں کر سکتے بھوجی!" ——— میرے دل نے کہا ———

میں بھی آہستہ سے چل کر دوسٹیرز کی تھنے میں ہو کر بڑا بابو کے اخبار نما چہرے کو پڑھنے لگا ——— لیکن میرے لئے تھیسو کر دینے والی کوئی بات نہ تھی۔

اس لئے میں فساد اور طوفان کے تاثر نہ پیدا کر سکا ــــــ بلکہ میرے اندر ایک بہت پرانی پہچان، ایک غیر شعوری آسودگی تھی۔

میں دور دراز کے سب ڈویژن میں ہینچر تھا میری سروس میں ای۔ بی وغیرہ کو لے کر کئی رخنے آگئے تھے۔ میں معاملہ کی مفصل درخواست لئے ہوئے بڑا بابو کے پاس آیا تھا۔ انھوں نے بڑی رعونت سے میری درخواست پڑھی۔ اسے ٹیبل کی دراز میں رکھا اور میری طرف فرعونی انداز سے بولے ــــــ

"کام ــــــ وام تو ہوتا رہے گا شرمیان ــــــ چلئے پہلے کچھ چائے پانی ہو جائے"

"جی ــــــ جی نہیں۔ شکریہ"

وہ میری طرف دیکھ کر تمسخرانہ مسکرائے اور اٹھتے ہوئے بولے۔

"آئیے بھی!" ــــــ اور اچٹتی ہوئی ایک نظر انھوں نے اور دگر دکام کرنے والے بابو لوگوں پر ڈالی۔ شاید وہ لنگاہ سگنل تھی۔ کیونکہ کئی ایک اٹھ کر ساتھ ہو لئے۔ دفتر کے باہر ایک معمولی سا ہوٹل نما چائے خانہ تھا۔ جہاں کئی طرح کی مہنگی مٹھائیاں، نمکین، سنگھاڑے اور دیگر چیزیں شیشے کے ایک شوکیس میں رکھی تھیں۔

جیسے ہی ہم وہاں پہونچے۔ ہوٹل والے نے ایک گندے سے کپڑے کو بینچ پر رگڑ دیا دیگر احساسات کی طرح، صفائی اور گندگی کا احساس بھی یہاں رسمی تھا ــــــ پھر بغیر کوئی آرڈر لئے اس نے چار بڑی بڑی مٹھائیاں ایک ایک طشتری میں ڈال کر سبھوں کو الگ الگ تھمادیں۔

مجھے ابکائی سی آئی۔ سویٹ ڈشیشنر کے معاملے میں میری پسند بڑی نفیس اور نازک تھی۔ اور بسیار خوری سے میں نفرت کرتا تھا میں نے بڑا بابو کی طرف دیکھا وہ لومڑی کی نظروں سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ طشتری میرے ہاتھوں میں کلنپنے لگی۔ میری دو مہینے سے تنخواہ بند تھی۔ میرے پاس صرف بارہ روپے تھے۔ واپسی کرایے کے لئے۔

"جی ــــــ یہ" ــــــ میں نے پناہ کی متلاشی نظروں سے ہوٹل والے کو دیکھا۔

"اجی صاحب ــــــ کیا کروں ــــــ آج تو بڑا بابو کے لائق مٹھائی ہی نہیں

سسرا دودھ والا نہیں آیا ـــــــ ورنہ بڑا بابو تو ہمیشہ اسپیشل مٹھائی کھاتے ہیں۔"

میں آہستہ آہستہ مٹھائی کے پیس کر کے نگلنے لگا ـــــــ مگر مجھ سے بہت پہلے ان لوگوں نے پلیٹیں خالی کردی تھیں۔ ہوٹل والے نے فوراً دوسری پلیٹ سامنے کردی تھی۔ جس میں دو۔ دو سنگھاڑے اور دو۔دو بنگلہ نمکیاں تھیں۔

پھر آلو ـــــــ چھولے کی کوارٹر پلیٹ۔

اور پھر اسپیشل چائے کے گلاس۔

میں دوا کی طرح انھیں اپنے اندر اتارتا رہا ـــــــ آہستہ آہستہ جیسے کینسر کے مریض کیپسول نگل کر پانی کے گھونٹ بھرتے ہیں ـــــــ مگر جیسے ہی میں نے گلاس رکھا بری طرح چونک اٹھا ـــــــ میں وہاں تنہا تھا۔ وہ سب کے سب پاس ہی پان کی دوکان پہ پہونچ چکے تھے ـــــــ میں نے شرمندگی سے دوکان والے کا پینتیس روپیے کا بل دیکھا اور پھر اپنے بارہ روپیے کو ـــــــ اچانک میری اور دوکان دار کی مشترکہ نظریں میری گھڑی پہ ٹک گئیں ـــــــ اور وہ بے حد مہذب انداز سے بولا۔

"کوئی بات نہیں حضور ـــــــ سب چلتا ہے۔" ـــــــ مجبوراً میں نے گھڑی اس کے حوالے کردی ـــــــ میری نظریں اس قافلے تھیں جو پان والے کے پاس میرا منتظر تھا۔

میں نے دوکان دار سے تقریباً گھگھیاتے ہوئے کہا۔

"دس روپیے بھی مجھے دید دکھائی" ـــــــ

اس نے میری دو سال پرانی "فیوولوبا" کو الٹ پلٹ کر دیکھتے ہوئے کہا۔

"گھڑی تو بہت پرانی ہے۔ خیر لے لیجئے"

اور دس روپیے کی یہ خیرات لے، میں پان کی دوکان پہ پہونچا ـــــــ "چار ـــــــ چار مگھئی ـــــــ مجھ جگہ ـــــــ وہ روپئے چالیس پیسے" ـــــــ پان والے نے مجھے بتایا۔ میں نے دس روپیے کا نوٹ تھما دیا۔ اور بقیہ کے پیسے بغیر دیکھے اپنے کرتے کی جیب میں ڈال کر ان کے کچھ کہنے کا منتظر رہا ـــــــ

انھوں نے اپنے پان سے بھرے ہوئے منہ کو زور ــــ
زور سے چلاتے ہوئے، ٹھوڑی کو کچھ اوپر کرکے، پیک سے بھرائی ہوئی
آواز میں کہا ــــ

"اچھا ــــ ایک مہینہ بعد آئیے" ــــ اور اپنے قافلے کے ساتھ مڑ گئے۔
اس دن میری واپسی کی کوئی ٹرین نہ تھی ایک رات رک جانے کی وجہ سے میری
واپسی کا کرایہ بھی ختم ہو گیا۔ کیونکہ فرسٹریشن میں بھوک کی شدت ہوتی ہے
ــــ کوئی سی بھوک ہو۔ اسی لئے میں نے سارے پیسے خرچ کر دئے۔
گھر میں کوئی اثاثہ بھی نہیں پھر ایک مہینے کا انتظار۔
زندگی میں پہلی مرتبہ میں بغیر ٹکٹ لئے ریل پہ سوار ہوا۔ اور رکشہ کے بجائے
بچتے بچاتے پیدل چل پڑا ــــ میں راستے بھر سوچتا رہا۔ میری سوچیں
سمت کھوئی ہوئی ہرنی کی طرح ادھر ادھر دوڑ رہی تھیں۔ بچے ــــ مستقبل
ــــ کوئی ــــ کوئی بھی نوکری ــــ مگر کلرکی نہیں ــــ
صحت ــــ ہاسپٹل ــــ صبر، آہ، دکھ، خوشی، سقراط، زہر۔
بادل آف ٹو ڈے ــــ ریل اچومینٹ ــــ لاسینز ان فارطینگ۔
واقعی ہمارا انسان اپنی پناہ کیلئے کتنے بند دروازوں کی کال بیل
پہ اندر اندر انگلیاں رکھتا ہوا گزرتا ہے۔ یہ مجھے اسی روز معلوم ہوا تھا۔
گھر آچکا تھا ــــ میری سوچیں بھی بکھر گئیں ــــ وہی مفلسی
وہی آشفتہ حالی میری منتظر تھی۔ بچوں کے کپڑے اس حد تک پرانے
ہو کر پھٹنے لگے تھے کہ میری بیوی جہاں سے بھی سلتی وہیں سے کپڑا مسک
جاتا ــــ دراصل ہمارے اردگرد جو حصار ہے اس کے اندر زندگی سے
بھی اہم مسئلہ کپڑے کا ہوتا ہے۔ نئے سلوانے کے لئے اتنا جبر کرنا پڑتا ہے
کہ آدمی خود کو بونا محسوس کرنے لگتا ہے۔ اور یہ نئے کپڑے اتنے سستے اتنے
پریشان کن حالات سے گزر کے اور اس طرح بنتے ہیں کہ کبھی مہینہ دن کے اندر
ہی حالت پہچانی نہیں جاتی ــــ تنخواہ تو بند تھی ہی ــــ دو تین ٹیوشن
کر کے کسی طرح گزارا کیا ــــ مگر اگلے مہینے کا بندوبست ایک ایسا سوال تھا
جس کا جواب میرے پاس کچھ نہ تھا۔ جیسے جیسے مہینہ ختم ہوتا گیا میری پریشانی
بڑھتی گئی ــــ میں یوں مضطرب تو نہیں تھا۔ مگر بیوی نے دردبدری کی طرح

ہی اچانک مجھے میری پریشانیوں سے آزادی دلائی۔ چہرے پر فکر کی نمایاں تحریروں کو پڑھ کر اس نے خاموشی کے ساتھ اپنے کانوں کی بالیاں میرے حوالے کر دیں اور کہا۔

"سوا بھر کی ہیں ——— انھیں بیچ کر چلے جائیے۔" ——— میں نے ان بالیوں کو دیکھا گھسی ہوئی میل خوردہ بالیاں سہاگ رات سے ہی میری بیوی کے کانوں میں جھولتی رہی تھیں۔ لمحے لمحے کی رازداں۔ سرگوشیوں کی امین ماں کا دیا ہوا اکلوتا زیور ——— میں تو کچھ بھی نہیں دے پایا تھا ——— ان بالیوں کے بغیر میری بیوی کا چہرہ کچھ ایسا ویران اور اجڑا ہوا لگ رہا تھا کہ احساس جرم کے بوجھ تلے میں نے خود کو بے حد ذلیل محسوس کیا لیکن تھوڑی ہی دیر بعد ان بالیوں سے ہوتی ہوئی میری نظریں گھر کے در و دیوار پر ٹک گئیں ——— جیسے اجڑتے ہوئے پلاسٹر کی ایک ایک اینٹ مجھے انھیں لے کر چلے جانے کو کہہ رہی ہو۔

اور میں سوا دو سو روپے لیکر پھر بڑا بابو کے دربار میں حاضر تھا۔ جاڑے کا زمانہ تھا۔ سوئٹر تو خیر تھا ہی نہیں۔ کیونکہ میری بیوی سوئٹر بننے اور طرح طرح کے پیٹرن جمع کرنے کے گُر سے بہت پیچھے تھی۔ ہاں کنوارے دنوں کی یادگار، ایک پرانا کوٹ اور راستے کی ٹھنڈک سے بچنے کیلئے ایک کمبل ———

بڑا بابو نے میری طرف اجنبی نظروں سے دیکھا۔ میں نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا ——— "آپ نے ایک ماہ بعد بلایا تھا۔"

اور آپ دن گن کے چلے آئے ——— ارے بھئی کام ایسے ہوتا ہے۔ درخواست لائے ہیں چلئے پہلے کچھ چائے پانی ہو جائے۔" ———

میں نے سو سو کے دو نوٹ بڑا بابو کی طرف بڑھا دئے۔ "آپ چائے پی لیجئے گا ——— میرا کام کر دیجئے۔"

وہ لہجے کی سنجیدگی سے چونکے ——— پھر سبز نوٹوں کی ہریالی ان کے لہجے میں شاداب ہو گئی ———

"ہاں ——— ہاں! بیٹھئے ——— ارے بھئی برجو ——— وہ فائل نکالو۔ ابھی ڈرافٹ بننا ہے ———" اور پھر انھوں نے کام شروع کیا۔ بیچ بیچ

میں سمجھی ان کے لئے پان اور چائے لاتا رہا ——

کام ختم ہوتے ہوتے شام ہوگئی۔ انھوں نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
" میں اوک کے صاحب سے سائن کرا لیتا۔ مگر میرے پاس گرم کپڑا نہیں۔ صرف
یہی ایک بنڈی ہے۔ گھر کیسے جاؤں گا" ——

میں نے ان کا مطلب سمجھتے ہوئے کمبل ان کی طرف بڑھا دیا۔ حالانکہ تصور
میں گڈو اور بلو کے ساتھ بیوی کا ٹھٹھرتا ہوا جسم مجھے جھنجھوڑ رہا تھا۔ بڑا بابو
نے قصاب اور بکری کی نظروں سے کمبل کو الٹ پلٹ کے دیکھا اور صاحب کے
کمرے کی طرف دستخط کیلئے چل دیے۔"

میرا کام ہو چکا تھا۔

یہ میری بڑا بابو سے پہلی اور مفصل ملاقات تھی۔ اس کے بعد بھی اکثر میری ان سے
ملاقاتیں رہیں۔ اور ہر مرتبہ مجھے بڑا بابو کے ڈرم کیلئے کافی تعداد میں چائے۔
پانی مہیا کرنا پڑی۔ میں نے یہ بھی سنا کہ بڑا بابو چلتے چلتے اگلی مرتبہ دیہات
سے گھی لانے کی بھی فرمائش کر دیتے ہیں —— میرے ایک کلرک سے
انھوں نے دو بورے باسمتی منگوائے تھے ——

لیکن وقت کے ساتھ ساتھ ساری تلخ یادیں بھی زائل ہو جاتی ہیں اور پھر کچھ
لوگوں کے اندر معاف کر دینے کا جذبہ بھی بہت ہوتا ہے۔ جس کا دوسرا کمرشیل
نام بزدلی ہے۔ اکثر میں نے بڑے خلوص سے بڑا بابو کو سمجھانے کے لئے بھی
سوچا تھا ——

اچانک سسکیوں اور ہچکیوں کی آوازوں نے مجھے چونکا دیا۔ "بڑا بابو چل
بسے" ان کے رشتہ دار، ملنے والے، بیوی بچے سب کے سب رو رہے
تھے۔ میری بھی آنکھیں بھر آئیں۔ بڑھاپا یوں بھی کومپرمائزنگ ایج ہوتا ہے۔

تعزیت کے لئے آنیوالوں کا سلسلہ بڑھتا ہی گیا۔ شام تک دفتر کے
سارے لوگ آ گئے۔ انھیں میں سے کسی نے بڑا بابو کے بڑے لڑکے کو جو کہ
بی، ایس، سی کا طالب علم تھا کہا تھا۔

" بڑا بابو ان سروس تھے۔ میں تمہیں اسی محکمہ میں نوکری دلوا دوں گا۔ میرا
اتنا ہولڈ کم انفلوئنس ہے؟ —— یہ تو ہونا ہی ہے۔ چلو پہلے کچھ چائے پانی ہو جائے"
اور اچانک میری نظریں بڑا بابو کی لاش پہ پڑے کمبل پر اتر گئیں

آدھا چہرہ

اس مخصوص پہچان نے اسے بُری طرح چونکا دیا۔
ٹرین کھلنے ہی کو تھی۔ مسافر ٹوٹے پڑ رہے تھے قلی نے اس کی اٹیچی کھڑکی سے اندر ڈال دی۔ جب ہی کسی نے اسے اوپر کھینچ لیا۔ وہ حیران و خجل سی اپنی منتشر سانسوں کو یکجا نہ کر پائی تھی کہ موقعہ کی نزاکت نے اسے سنبھال لیا۔
ٹرین نے منٹوں میں رفتار پکڑ لی تھی۔

"آپ!" ——

"تم!" ——

دو الفاظ بہت ہی عام اور بے حد خاص، بہت روایتی اور بالکل مخصوص، اس اختصار میں کتنی تفصیل پوشیدہ تھی۔ وہ اس کا تصور کر کے اندر اندر کانپ گئی۔ بہت گہرائیوں کے اندر جھٹکا سا ہوا۔ اور کچھ ٹوٹ کے بکھر گیا۔

چکنا چور ہوگیا۔ کرچیوں بھرا یہ وجود، وہ نہ جانے کب سے اٹھائے ہوئے پھر رہی تھی۔ آج کیا ٹوٹا تھا جو کل نہ ٹوٹ چکا ہو۔ جڑنے اور بکھرنے کی یہ داستان کچھ کہی ہوئی تھی اور کچھ ان کہی۔

اسی نے اس کے لئے لوگوں کو ادھر ادھر سرکا کے تھوڑی سی جگہ بنا دی تھی۔ وہاں وہ اپنے بڑے سے ہولڈال پہ اپنا بریف کیس رکھ کے اس کے اوپر بیٹھ گئی۔ اور وہ اس کے سامنے تقریباً ترچھا ہو کر کھڑا تھا۔ ایک ہاتھ سے اس نے برتھ کی زنجیر پکڑ رکھی تھی۔ اور پیچھے سے لوگوں کے دھکے نے اسے تقریباً جھکا ڈالا تھا۔ اس کے بریف کیس پہ اتنی جگہ تھی کہ وہ آسانی سے بیٹھ سکتا تھا۔ اس کا جی چاہا، وہ اسے ہمیشہ کی طرح پکار کے کہے۔

"بیٹھئے تو —— خواہ مخواہ پوز دئے جا رہے ہیں" مگر اس کے لب جیسے سِل گئے تھے —— وہ تو یہ بھی نہ پوچھ سکی۔ کہ وہ پہلے کی نسبت اتنا دبلا کیسے ہو گیا ہے۔ چہرے پہ وقت کے قدموں کے نشانات صاف نظر آ رہے تھے وہ کتنا بدل گیا ہے۔ آج اس نے سفید بے داغ قمیص کی جگہ بے حد عامیانہ رنگ کے کپڑے پہن رکھے تھے۔ وہ بس اس کو دیکھے جا رہی تھی۔ وہ بھی تو اسی کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی نظروں میں کتنے ہی سوال تھے۔ بے کل اور بے چین سے سوالات نے اس کے چہرے کے گرد دھواں سا بکھیر ڈالا تھا۔

ایک چھوٹے سے اسٹیشن پر گاڑی یونہی رک گئی اور مسافروں کا ایک سیلاب در آیا۔ سوار ہونے والوں میں اکثریت اجڈ لوگوں کی تھی ایک شخص تو پوری قوت سے اسے دھکیل کر اپنے لئے جگہ بنانے کی کوشش میں تھا۔ اور اس کے لئے توازن قائم رکھنا دشوار ہو رہا تھا۔ شدت ضبط سے اس کے چہرے کی نسیں کھنچ گئی تھیں۔ اس نے بے بسی سے اپنے بریف کیس کی بچی ہوئی جگہ کو دیکھا —— پھر اسے —— اور بڑی مشکل سے خود کو سنبھال کر بولی ——

" آپ بیٹھ جائیے —— یہاں کافی جگہ ہے "۔ ——

وہ چونکا —— اس کے ہونٹوں پہ ٹھٹھری ہوئی طنزیہ مسکراہٹ ابھری۔

"جی شکریہ —— ایس آل رائٹ" ——

وہ اس طنزیہ مسکراہٹ پر اندر اندر کھول اٹھی۔ مرد کس خوش فہمی کا شکار ہوتا ہے وہ آج تک نہیں جان سکی ——— تو "خوش فہمی" اور "زعم" کا طلسم اب تک باقی ہے ——— وہ سوچ کے جھلائی ——— پھر سنبھل گئی ——— یہ جھلاہٹ بھی کتنی لایعنی ——— کتنی فضول اور بے وجہ تھی ——— اسے خود پہ ہنسی آئی ——— اور جب خود پہ ہنسی آئے تو ہنسنا گریہ بے اختیار سے بھی معنی خیز ہوتا ہے۔ اچانک وہ پوچھ بیٹھا ———

"تم ——— آپ ——— اس طرح اکیلی سفر کر رہی ہیں!؟ ———

وہ پھر اندر سے سلگ اٹھی ——— آخر حاکمانہ احساس غالب آ ہی گیا۔

اپنے ایک پرانے خیال کو تقویت دینے لگی وہ ———

اس کے اندر مینرس کی شروع ہی سے زبردست کمی ہے۔ بے تہذیب ان کلچرڈ ——— اس کا جی چاہا زور سے کہہ دے ———

"کسی سے ذاتی سوال کرنا بدتمیزی ہے۔ کیا یہ حق اسے ہے کہ وہ اسکی مصروفیتوں کے متعلق پوچھے ——— ؟" ——— اچانک اس کا سارا وجود سرد پڑ گیا۔ اس نے سوچا ——— بہر حال آج وہ اجنبی ہے ——— چار، پانچ گھنٹوں کے اس سفر کے بعد پھر نہ جانے کہیں ملاقات ہو یا نہیں۔ ——— شاید نہیں ——— اس کے اندر کی آواز نے اسے اسی لمحے باخبر کیا ——— زندگی ان راستوں سے کبھی نہیں گزرے گی ——— ابھی جو اتفاقاً وہ تھوڑی دیر کا ہمسفر بن گیا ہے تو شاید یہ اسی کے انتر آتما کی کوئی طلب رہی ہو ——— نافہم سی ——— شاید وہ اس کے متعلق بہت کچھ پوچھنا چاہتی ہے ———

لمحے وزنی سِل کی طرح گر کے چکنا چور کر سکتے ہیں اور آرے کی طرح چیر کے رکھ دیتے ہیں۔ یہ اسے اسی پل محسوس ہوا اور اسے لگا جیسے اس کا ریزرو ہونا ——— سلف سینٹرڈ ہونا ——— اس کی ذہانت آمیز مسکراہٹ ——— اس کی طنزیہ نظر کی معنی خیزی ——— الفاظ کے دریچوں سے لاشعور کے تاریک کمروں کی تصویروں کو ٹٹولنا ——— یہ سب کچھ کتنا بے معنی ہے۔ ان گنت قیمتی لمحے اختیار سے گزر کے ماضی کے غار میں کھو چکے ہیں ——— یہ پل پھر بھی اسی تاریکی کی امانت ہے۔

—— کیا وہ نہیں جانتی۔ کیا یہ محض اسی کی خود فریبی نہیں —— مگر پھر اس کی مخصوص فطرت نے جھنجھلا کر اسے بتایا —— یہ خود فریبی صرف اسی کی نہیں —— بلکہ اسی کی نہیں ہے ——

شاید اس کا ذہن بھی انھیں راستوں سے گزر رہا تھا۔ اس نے سوچا آخر ایسا کیوں ہوا ہے؟ —— ہمیشہ تو اس کی سوچیں مخالف ہوا کرتی تھیں۔ کیا اس نے بھی ہار مان لی ہے؟ —— کیوں وہ اس کے بریف کیس کی بچی ہوئی جگہ پہ —— اس سے تھوڑا الگ ہو کے بیٹھ گیا ہے ——

اس نے اس کی طرف دیکھا —— وہ بھی اسی کو دیکھ رہا تھا اس کا بے چین دل بے آواز چیخ پڑا —— آخر تم جو پوچھنا چاہتے ہو، پوچھتے کیوں نہیں کہ میں تھوڑی دیر بعد اتر جاؤں گی —— اس کی قربت نے فاصلے کے احساس کو اور بھی شدید کر دیا تھا —— اسے یاد آیا۔ اکثر وہ اس کے ساتھ تانگے یا رکشے میں بیٹھتی تو قصداً جہاں اس کا کوئی شناسا نظر آیا کرتا اس کے پاس سرک آتی اور اس کی سراسیمگی پہ کھل کر ہنس پڑتی —— وہ کبھی کمر کے پیچھے ہاتھ رکھ کر اسے چھیڑتا اور وہ راہ گیروں کی طرف اشارہ کر کے منہ چڑا دیتی۔

"اب آپ کی طبیعت کیسی رہتی ہے؟" اس نے سوال کیا ——

وہ دوسری مرتبہ چونکی —— یہ آج بغیر الفاظ کے، اس کے دل کی زبان کیسے سمجھنے لگا۔ یہ آگہی اسے کہاں سے ملی؟ —— اس کی بے چین آنکھوں کی کربناک تحریر سے، لمحات کی گریز پائی کے درس سے، یا کہ خود اس کی روح بھی اسی پل صراط پہ چل کے آبلہ پا ہوئی جا رہی ہے۔

"ٹھیک ہوں۔ آپ کیسے ہیں؟" ——

"میں ٹھیک ہوں —— حال ہی میں ٹرانسفر ہو گیا ہے"

وہ بے حد محتاط جواب دے کر چپ ہو گیا —— وہ جانتی تھی وہ کتنا باتونی ہے۔ بے بات کی بات نکال کر گفتگو کو از حد دلچسپ اور مزاحیہ بنا دینے کا گر اسے آتا تھا۔ پھر کیا آج میری طرح وہ بھی خوفزدہ ہے"

اس خوف کا سرا کیا ہے۔ فاصلے کی ابتدا کب ہوئی۔ جیسے ہلکی سی دراڑ —— بہت بڑی خلیج بن گئی تھی —— واقعی لمحات سراب۔

ہوتے ہیں۔ اور الفاظ انسان کے سب سے بڑے دشمن ! ——

" دیکھو میڈم —— میں خاصا صحت مند ہوں —— خوبصورت بھی ہوں —— اچھی ملازمت ہے —— ترقی بھی ہوگی —— ایسا نہ ہو تم میرے بدلے کسی اور کو پسند کرنے لگو " ——

وہ ہکا بکا سی اسے دیکھنے لگی تھی ——

و بھئی —— تم ریلیشینٹ ہو —— کسی کو دل سے خوش آمدید کہدو گی تو پھر —— میں ہوں بہت تنگی ؟ " ——

" عجیب مصیبت ہے —— آج رش کتنی زیادہ ہے " ——

اس نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا ——

پھر ٹرین رک گئی —— ایک موٹے سے آدمی نے اوپر کی برتھ سے اٹیچی کھینچی تو اٹیچی اس کے ہاتھوں سے چھوٹ کر اس کے پیروں پہ آگری —— اس نے تکلیف کی شدت سے اپنے پیروں کو تھام لیا۔ وہ بالکل حواس باختہ ہو گیا۔ جلدی سے اس نے بیگ سے آیوڈیکس کی شیشی ڈھونڈ نکالی۔ اس کے پیر کے انگوٹھے اور دوسری انگلی میں لگایا اور اپنے رومال کے دو ٹکڑے کر کے لپیٹ دیا۔ یہ سب کچھ اتنی جلدی اور ایسے اچانک ہوا کہ وہ خود ہی جیسے ہی گرہ لگا کے اٹھی خود سے نظریں چرا ایک طرف سمٹ گئی۔ وہ بھی خجل سا تھا اور بڑی مشکل سے صرف یہ کہہ سکا ——

" شکریہ ! —— اس زحمت کی کیا ضرورت تھی ؟ " ——

گاڑی رکی تھی۔ وہ آہستہ سے اٹھنے لگا اس نے سوالیہ نظروں سے دیکھا ——

" دیکھئے —— میں دیکھتا ہوں۔ شاید یہاں کافی مل جائے۔ ورنہ چائے والے کو بلواتا ہوں " ——

" افوہ —— اتنی چائے مت پیو میڈم —— ہارٹ اٹیک سے مر جاؤ گی تو جیتے جی میں بھی مر جاؤں گا —— ہاں " ——

" یہ جو تم کافی کی پیالی رکھے رکھے دیکھا کرتی ہو —— کیا سوچتی ہو کیا کسی کو ریسیو کرتے ہوئے خود کو ہی سونپ دیا گیا ؟ " ——

" پلیز —— مذاق مذاق ہوتا ہے —— نیور کراس دی میٹ " ——

" یہ لیجئے —— اچھی چائے ملی ہے۔ میں نے خود بنوائی ہے " ۔ اس نے

کھڑکی کے پاس سے پکارا ـــــ اس نے دیکھا، چائے دیتے ہوئے اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ اور پیالی خود اس کے ہاتھ میں بھی لرز رہی تھی۔ جیسے کہیں زلزلہ آگیا ہو۔ حالانکہ وہ بالکل ساکت اور جامد تھی۔

اس نے خلاف عادت ٹھہر ٹھہر کے چائے پی۔ جیسے اس کا ایک ایک قطرہ کسی بہت ہی فلسفیانہ کتاب کے الفاظ کی طرح ہو پھر بھی۔ جو وہ سمجھ سکی، اس کا اعتراف اس کے لئے سمجھ لینے سے مشکل تر تھا۔ اس نے پیالی واپس کر دی۔ ذرا سی دیر میں گاڑی پھر چل پڑی۔ سامنے والا آدمی اتر چکا تھا۔ سوفوکیشن ذرا کم ہوا تو کھڑکی سے ہوا آنے لگی۔ اچانک ایک تیز جھونکے نے اس کا آنچل اس کے منہ کی طرف کر دیا۔

"جانتا ہوں تمہیں ہلکا گلابی رنگ بہت پسند ہے۔ اچھا بھی ہے مگر کیا ضروری ہے کہ دفتر بھی اسی کو پہن کر جاؤ" ـــــ

"آخر کہنا کیا چاہتے ہیں؟" ـــــ

"یہی کہ جتنی دیر تم باہر رہتی ہو۔ میری جان سولی پہ ہوتی ہے" ـــــ

"آئی۔ ایم ناٹ سو چیپ" ـــــ وہ تقریباً چیخ پڑی۔

اس چیخ کی گونج آج بھی اس کے اندر لرز رہی تھی۔ اس کا چہرہ اب بھی اس لمحے کو یاد کر کے پسینے سے بھیگ گیا۔ اس نے اس کی طرف بغور دیکھ کر کہا۔

"آج کتنے عرصے بعد، آپ کو اس رنگ میں......"

اس نے اچانک کہتے کہتے اپنی بات کاٹ دی۔ جیسے اپنے بے ساختہ الفاظ پر شرمندہ ہو گیا ہو۔

"......آپ سے ملاقات ہوئی ہے" ـــــ

"جی ہاں ـــــ اتفاق کی بات ہے" ـــــ

"آپ کی ماں تو ٹھیک ہیں نا؟" ـــــ اس نے رسمی طور پر پوچھا۔

"جی شکریہ!" ـــــ

"کہاں ہیں وہ ـــــ؟" اس نے پھر پوچھا۔

اس نے خالی خالی نظروں سے چھت کی طرف اشارہ کیا اور پھر بول اٹھی۔

"وہ ختم ہو گئیں ـــــ اور آپ نے مجھے اطلاع......"

مگر پھر الفاظ گھٹ کے رہ گئے اور وہ خلاء کو دیکھنے لگی ـــــ

"بھئی ــــ وقت یا تو وقت گزر کیلئے ہے یا یاں کے لئے ــــ آخر ان کے کون سے کام ہیں؟ - تمہیں میرے قریب نہ رہنے کا عذر چاہیئے ــــ"

"ماں کی خدمت صرف ذمہ داری تو نہیں - فرض بھی ہے"۔ ــــ

"فرض ــــ فرض ــــ فرض ــــ" وہ پھر پسینہ خشک کر رہی تھی

بہت سارے نئے مسافر ادھر ادھر آ بیٹھے تھے ــــ

ایک نو عمر لڑکا ایک فلمی رسالہ دیکھ رہا تھا ــــ جسکی پشت پر کسی ایکٹریس کی عریاں تصویر چھپی تھی - دفعتاً اس نے لڑکے سے پوچھا ــــ

"کس کلاس میں پڑھتے ہو مسٹر؟" ــــ

"میٹرک کا امتحان دیا ہے"۔

"اور یہ بازاری رسالے پڑھنے لگے - ہم آپ سے بڑے ہیں - بڑوں کا لحاظ تو کرنا چاہیئے"۔ ــــ

وہ یکبارگی چونک اٹھی ــــ یہ الفاظ کس کے تھے ــــ کب کے - اپنے یا مانگے کے -

"کہو تو آج تمہارے بھائی کو یہیں سلا دوں!" ــــ

"آپ ہوش میں تو ہیں؟" ــــ

"ارے میڈم - تھوڑی بھی ٹریننگ ــــ تم تو بگڑ گئیں ــــ ارے بھئی مذاق ہے"۔ ــــ

"یہ مذاق ہے" ــــ وہ چیخ اٹھی ــــ اس کا بھائی بظاہر اخبار پڑھتا رہا ــــ اور وہ خود اپنی بلندیوں سے اس طرح گری کہ پاش پاش ہو گئی - ان کرچیوں کو چننا اس کے بس کا نہ تھا ــــ وہ کتنی لہولہان، کتنی آبلہ پا ہو چکی تھی ــــ

کتنا مضحکہ خیز سوال تھا ــــ کلچر اہم ہے یا دولت بغیر دولت کے کلچر سے وہ اپنی پہچان رکھتی تھی ــــ مگر بغیر کلچر کی دولت نے اس سے اس کی پہچان چھین لی تھی ــــ پھر بھی وہ ان پُر خار راستوں سے اپنی بازیافت نہیں کر سکتی تھی - شدت کرب اور ضبط کی انتہا سے اس کا چہرہ تمتما اٹھا ــــ

یہ خلش ــــ یہ بے لبی اور یہ خوف ــــ وہ اندر سے لرزہ بر اندام

ہوگئی ـــــ ٹرین پھر تیز رفتار ہوگئی تھی ـــــ اس کی منزل قریب آتی جارہی تھی۔ لمحۂ گزراں نے اسے پھر خوف زدہ کر دیا۔ شاید وہ ان لمحوں سے کچھ حاصل کرنا چاہتی تھی ـــــ فرار ـــــ خودفریبی ـــــ سکون ـــــ نہ جانے کیا؟ ـــــ

"آپ کی فیملی؟ ـــــ وہ آخر دار پر چڑھ گئی ـــــ

وہ ہنس پڑا ـــــ

"میں جانتا تھا ـــــ تم یہ ضرور پوچھوگی ـــــ مگر شاید تم کو یہ سُن کر دکھ ہو کہ میں ایک فیملی رکھتا ہوں!" ـــــ

حسبِ مزاج آج بھی اس کے طنز کا وار گہرا تھا ـــــ

"بچے؟"

"صرف ایک" ـــــ

اگر وہ واقعی دار پر ہوتی اور اس سے آخری خواہش پوچھی جاتی تو شاید وہ ان لمحوں کو واپس مانگ لیتی ـــــ کچھ ایسی ہی شرمندگی اور افسردگی محسوس کر رہی تھی وہ ـــــ حالانکہ اس کی ازدواجی زندگی کی خوشیوں سے اسے کوئی واسطہ نہ تھا ـــــ پھر بھی وہ چاہتی تھی کہ کوئی غیرمرئی طاقت اس کے الفاظ کی صدا چھین لے۔ ایسا ہی کچھ محسوس کیا تھا اس نے ـــــ اور وہ بدستور مسکراتی رہی۔

"بھئی ـــــ تم چھٹیوں میں گھر جانے کا پروگرام مت بنایا کرو ـــــ"

"کیوں آخر؟" ـــــ

"اس لئے نہیں کہ میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔ بلکہ اس لئے کہ جتنے دن نہیں ہوتی ہو میرا ذہن شکوک کے جہنم میں جلتا رہتا ہے"۔

"ٹھیک ہے ـــــ ... آئندہ آپ میرے بغیر ہی رہیں گے" ـــــ

"کتنی لیٹ تھی ٹرین ـــــ ڈارلنگ تمہارے بغیر جینا محال تھا"۔ گاڑی کے رکتے ہی اس کے شوہر نے کھڑکی کے پاس آکر کہا ـــــ اور وہ جو کہ بہت ہی کلچرڈ تھی ـــــ اس بے حد بازاری اور سطحی اظہار محبت کے سائبان میں چھپ کر اسے دیکھنے لگی کہ شاید وہ پچھتا دے گی

دھوپ میں جل رہا ہو۔ مگر اس کے ہونٹوں پہ بڑی منجمد سی، تلخ سی،
ہتی تہی سی ایک مسکراہٹ تھی۔

اس کا شوہر اسٹیشن پر سامان رکھوا رہا تھا اور وہ
ایک چوڑی والے کے سامنے رک کر چوڑیاں پیک کرواتے ہوئے اسی
کو دیکھ رہی تھی۔ وہ بھی بظاہر چوڑیاں خرید رہا تھا مگر اسی کی طرف نظریں
تھیں —— سرخ رنگ کی چوڑیاں نیلے کاغذ میں لپٹی جا رہی تھیں ——
اس کا جی چاہا، وہ اس کے ہاتھوں سے چوڑیاں لے لے، کہ یہ تو اس کا حق
تھا —— صرف اس کا ——

وہ کھنچتی چلی گئی ——

اس نے اس کی ڈبڈبائی آنکھوں کو دیکھا اور پیکٹ اس کی طرف بڑھا دیا
—— معاً اس کے سنجیدہ مزاج، کاروباری، پکی عمر کے شوہر کی
نظر اس کے پیکٹ پر پڑی اس نے جیب سے ایک دس کا نوٹ چوڑی
والے کی طرف بڑھا دیا۔ اور وہ خاموشی سے اس کے پیچھے پیچھے چل پڑی!!!

ماہنامہ "ہم زبان" اپریل سنہ ۱۹۶۹ء

ایک شام

آج کی شام میرے لئے ایک مسئلہ تھی - اکثر شامیں
میرے لئے مسئلہ ہو گئی ہیں ——— حالانکہ زائل ہوتی سرخیوں اور
مدھم ہواؤں کا سنگیت مجھے بے خود نہیں کرتا ۔ بلکہ اکثر میری ضرورت
ہی تلوار کی دھار بن جاتی ہے۔
اچانک میرا ذہن فلیٹ نمبر دس کی طرف مڑ گیا
اور اس فلیٹ میں رہنے والی کی شبیہ ابھرنے لگی - پرکشش جسم
اور تیکھے نقوش والی وہ عورت پتہ نہیں کون ہے - اتنی ڈسپلنڈ
اور ڈسٹینڈ ہوئے میں زندگی گزارنے کے پیچھے کون سے راز پوشیدہ
ہیں حالانکہ مجھے شخصیتوں کے اندر جھانک کر دیکھنے میں کوئی دلچسپی نہیں پھر
بھی شام کے اس اکیلے پن نے اس کے سراپے کو میرے ذہن پہ مسلط
کر دیا ہے۔

میں نے لاشعور سے پوچھا۔
"کیا آج کی شام میں اس کے ساتھ گزارنا چاہتا ہوں، جسے جانتا بھی نہیں"۔
لاشعور چپ ہے، تعارف۔ دوستی، ذہن اور نظریاتی ہم آہنگی، طلب، اور شکست یہ سارے مراحل ایک شام میں کیسے طے ہو سکتے ہیں؟...
حالانکہ میں کمرشیل آدمی ہوں ——— میں نے شروع ہی سے پیسوں کے عوض خریدنا سیکھا ہے ——— ہمیشہ ہی، سبھی کچھ ——— خریدنے کی علاوت اب میری فطرت میں داخل ہے ——— بیوی ہو نہ ہو ——— کام ہو تو بھی، نہ ہو تب بھی، مجھے اکثر چینج کی ضرورت ہوتی ہے ——— اور اس چینج میں میں ایسا منجھا ہوا آدمی ہوں کہ مجھے کوئی پریشانی نہیں ہوتی ——— نہ میں شاعروں کی طرح شاعرانہ انداز سے محسوس کرنا چاہتا ہوں نہ نوجوانوں کی طرح جھجک جھجک کے اور ڈر ڈر کے قدم اٹھانا پسند کرتا ہوں۔ نہ سنیما اور کافی بورڈ میں جا کر پیسے برباد کرتا ہوں، میں جانتا ہوں، آج ہی کی نہیں، ہر زمانے کی لڑکیاں بزنس مائنڈیڈ ہوتی ہیں اگر میرا مستقبل سیکور نہ ہوتا تو کیا میری بیوی کا باپ تیس ہزار روپے دے کر مجھے خریدتا۔ اگر مجھ میں قیمتی تحفے کی امید نہ ہوتی تو کیا نہیں مجھے رجسٹرڈ راکھیاں بھیجتیں! ماں! ——— انھوں نے چٹانوں سے گھری ہوئی ریت زدہ زمین پر ایک پودا لگایا تھا اور خود چل بسیں ——— لیکن میرا خیال ہے، اگر وہ ہوتیں تو شاید وہ بھی بوڑھی کے گھنے سائے کا اعتراف کر ہی لیتیں ——— میں ایک سچ ہوں ——— آجکل کا بہت بڑا سچ ——— میرے اندر غلط جیسی کوئی چیز نہیں ——— کوئی ساختہ کارنہیں ——— کوئی دھوکہ بازی نہیں ——— میں عام سی گھریلو لڑکیوں کو رومانی خطوط لکھ کر کس طرح کی خواب فروشی نہیں کرتا ——— میں انھیں ان دیکھے جزیروں کی سیر کراتا۔ میں ایسی تمام عورتوں سے نفرت کرتا ہوں جو سیتا کے لبادے میں روپ نکھار کو چھپائے پھرتی ہیں۔
میرے دفتر کی بائیس لڑکیوں میں ایک بھی ایسی نہیں ——— یہ سب کی سب حقیقتوں کی ٹھوس زمین پہ قدم جمائے جدوجہد میں مصروف ہیں۔ ان کے مقاصد الگ ہیں ——— کسی نے دیو ورس

ہائی اسٹینڈرڈ لائف کی طرف قدم بڑھایا ہے ——— کسی کو لمبے چوڑے خاندان کی کفالت کرتے ہوئے اسٹینڈرڈ مین ٹین کرنی ہے تو کسی کو اس حد تک بیلنس کر لینی ہے کہ اچھی سی ازدواجی زندگی خرید سکیں ———

میں نے ان میں سے کسی کے ساتھ فلرٹ نہیں کیا ہے مجھے فلرٹیشن سے نفرت ہے ——— میرے اندر کوئی آیا کھوکھلا پن نہیں جو باہر سے نظر نہ آتا ہو۔ میرے دفتر کی شیشے کی دیوار کی طرح سب کچھ پاردرشک ہے۔ اگر مجھے ان میں سے کسی کو "ضرورت" کے تحت انگیج کرنا ہوتا ہے تو میں اپنے پیون "اودے" کے ساتھ سلپ بھیج دیتا ہوں ——— اگر وہ فری ہوتی ہیں تو میرے لئے دفتر کے باہر ویٹ کرتی ہیں، یا پھر آ کے کہہ جاتی ہیں۔

"ساری سر ——— آج میری پرسنل انگیجمنٹ ہے" ———

میں ان سے ناراض نہیں ہوتا ہوں۔ ان کے دفتری کاغذات میں انتقامی غلطیاں ڈھونڈ کر ایکسپلانیشن نہیں کال کرتا ——— میرے اندر خود سے، ضرورت سے اور زندگی سے سمجھوتے کی ایک زنجیر چھپی ہے اس لئے میں کبھی کسی پل ٹوٹتا بکھرتا نہیں، ڈس بیلنس نہیں ہوتا بہت زیادہ پی کر اودھم نہیں مچاتا، بیوی اور بچوں پر عتاب بن کر نازل نہیں ہوتا۔ میری گھریلو زندگی پر سکون اور نرم رَو دریا کی طرح اپنی رفتار سے گزرا کرتی ہے ——— بچوں کی اپنی مصروفیتیں، اپنی دلچسپیاں اپنی سرکل ہے ——— بیوی کی الگ سوسائٹی ہے۔ وہ اپنے دائرے میں اس طرح گھری ہوئی ہے کہ اگر وہ کسی ہوٹل میں مجھے کسی کے ساتھ بیٹھے ہوئے یا کاؤنٹر پہ بکنگ کرتے ہوئے دیکھتی ہے تو بھی کچھ نہیں کہتی ہے ——— نہ میں پوچھتا ہوں، وہ کس کے ساتھ تھی، کیوں تھی؟ میں جانتا ہوں، وہ بہر حال تھکی ماندی گھر آجائے گی، جیسے وہ جانتی ہے مجھے بہر حال رات کے آخری پہر کو شب گزاری کے لئے فوم کے اسی نرم اور اسپرنگ دار بستر، اسی تموز لائٹ بلب، ہلکے نیلگوں پردوں کے اندر سے جھانکتی ہوئی نیلی دیواروں کی ضرورت ہے ——— بچوں نے مجھے کبھی ڈسٹرب نہیں کیا ——— میں بہت ہی بیلینسڈ آدمی ہوں۔

جبکہ آج کل اکثریت غیر متوازن لوگوں کی ہے ـــــ میرے طبقے میں بھی، مجھ سے نیچے والوں میں بھی اور جو ان سے بکمتر ہیں، ان میں بھی ـــــ میرا خیال ہے وہ "لائف اِن آرٹ" سے واقف نہیں۔ جو فضول کی سوچیں چن چن کر اپنی راہوں پر کانٹے بچھا لیتے ہیں ـــــ آئیڈیلزم کی اینٹ اینٹ، تیز جلتی دھوپ میں ریتیلی زمین پہ چل چل کے جمع کرتے ہیں ـــــ اور پسینے پسینے ہو کر اپنے گرد ایک حصار بنا لیتے ہیں ـــــ اور پھر خود ہی واویلا مچاتے ہیں ـــــ

"دیکھو بھئی ـــــ میرا دم گھٹ رہا ہے ـــــ زندگی یہ ہے۔ زندگی وہ ہے ـــــ کبھی بار میں جا کر گلاسیز توڑتے ہیں، کبھی شریف لڑکیوں کے ساتھ عشق بازی میں مصروف ہوتے ہیں تو کبھی اپنی مفلوک الحالی کا گریبان چاک کر کے اپنے ان نام نہاد زخموں کو جو دراصل ان کے ناخنوں کا ہی نشان ہوتا ہے۔ مجھے ایسے لوگوں سے زیادہ اس طبقے کے لوگ اچھے لگتے ہیں جنہیں اگر مزدوری نہیں ملتی یا کم ملتی ہے تو گھر آ کر بیویوں کو پیٹ ڈالتے ہیں تو کبھی اس قلیل آمدنی اور بے پناہ ضرورتوں سے گھبرا کر سارے پیسوں کی تاڑی پی جاتے ہیں یقیناً ان کے اندر جو فرینکنیس ہوتا ہے وہ ان لوگوں میں نہیں ہوتا جو کلچرڈ کہے جانے کے باوجود بڑے وحشی ہوتے ہیں۔

آج کی یہ عجیب و غریب شام میرے لئے نہ جانے کیوں مسئلہ بن گئی ہے اور وہ اجنبی عورت مجھے بہت یاد آ رہی ہے جس کا نام بھی مجھے معلوم نہیں اور جس سے میں کبھی نہیں ملا ہوں۔ ہاں اکثر اسے ٹھیک وقت پہ تیار ہو کر، کاندھے پر بیگ لٹکا کر باہر نکلتے دیکھا ہے اور وقت مقررہ پر کوارٹر کا تالا کھول کر اندر داخل ہوتے دیکھا ہے ـــــ نہ وہ اس عمر کی ہے جس میں عام لڑکیاں بھی ایک اپیل ہوتی ہیں۔ اور نہ میں ایسا ہوں۔ کیا اس عمر کے اس موڑ اور زندگی کے اس اسٹیج پر بھی "لو ایٹ فرسٹ سائٹ" کا امکان ہوتا ہے؟۔

مجھے اپنے اس سوال پر خود ہی ہنسی آ گئی ـــــ

"باؤنسی ازاٹ بھئی" ـــــ اور میں نے ایک ایک کر کے

چار لڑکیوں کے پاس باری باری سے سلیپ بھجوائے ہیں۔ اور یہ اتفاق ہی تھا۔ چاروں نے معذرت کر لی ہے۔ میری آج کی پہچان۔ میری آج کی ضرورت اسی ٹائپ کی محتاج تھی اور نعم البدل یا "اصل کی پہچان"
میرے لاشعور سے چھپتی پھر رہی تھی۔ میں حسب معمول دفتر سے نکلا۔ ڈرائیور گیٹ کھولے منتظر تھا۔ مجھے بیٹھنے کے بعد وہ جگہ بتانی ہے۔
—— لیکن کہاں —— ؟ —— میں کوئی فیصلہ نہ کر سکا۔ اور ٹالنے کی غرض سے کہا —— "اسٹیشن کی طرف!" —— اور ڈرائیور میرا موڈ دیکھ کر متوازن انداز سے ڈرائیو کرتا رہا۔ میں کھڑکی سے باہر کی طرف دیکھتا رہتا ہوں —— بس یونہی —— راہ چلتے لڑکیوں کو دیکھ کر سیٹی بجانے یا کڈنیپ کرنے کا میرا کوئی ارادہ نہیں
—— میں تو دراصل یوں ہی ٹہلنے لگا تھا —— بلا مقصد
—— جبھی اچانک وہ مجھے نظر آگئی —— وہی پڑوسن!
اور میرا دل ایک انوکھے انداز سے دھڑکنے لگا۔ یہ دھک دھک میرے لئے قطعی نئی چیز تھی۔ میرا جی چاہا جلدی سے اسے روک دوں اور باتیں کرنے لگوں —— مگر میری اس کے ساتھ ہیلو ہیلو بھی نہیں۔ میں اس سے کیسے باتیں کروں —— اتنی ریزرو، اتنی رعب دار —— نہ جانے وہ مجھے کیا سمجھے۔ اچانک جیسے میرا اعتماد ٹوٹنے لگا اور میں آگے بڑھ گیا ——
ڈرائیور نے رفتار ذرا اور کم کر دی تھی —— اب نسبتاً کم بھیڑ والے راستے سے گزر رہا ہوں —— معاً مجھے خیال آیا —— آج ایک مصوری کے "ادگھاٹن سماروہ" کا کارڈ میری بیگ میں پڑا ہے —— میں وہیں چلنے کو کہتا ہوں —— کچھ تضیع اوقات —— چینج آف موڈ —— اور آرٹ آف دے ہونا۔ زندگی کو متوازی رکھنے کے لئے ضروری ہوتا ہے۔
ڈرائیور تھوڑی دیر بعد ہال کے باہر پارک کر دیتا ہے۔ رنگ برنگے بلب سجے ہیں۔ افتتاح ہو چکا ہے —— میں بھی اندر داخل ہو جاتا ہوں —— حالانکہ مصوری اور جدید مصوری سے مجھے کوئی لگاؤ نہیں۔ آخر اس میں ہے کیا؟ —— بس سیلف سٹیفکیشن اور فرسٹریشن کا رد عمل —— میں اکتایا اکتایا سا ٹہلنے لگا۔ کئی لڑکیاں جماعت میں۔ کچھ پرنٹس کے ساتھ۔ کوئی کسی لڑکے

کے ہمراہ —— کچھ اکیلی اکیلی ماڈرن اور بے حد ذہین ہونے کا رعب جمانے میں مصروف تھیں —— اتفاقاً مجھے وہ بھی یہاں نظر آئی ——
"ہاؤ فولیش!" —— میرے دل نے مجھے ٹوکا —— "اٹ ازاے چیپ ٹو اسٹوری" —— اور میں اپنے آپ سے بری طرح ڈر گیا —— گھبرا کے ہی میں نے اسے "ہیلو!" کہا —— اس نے میری طرف ناپسندیدگی کی نظروں سے دیکھا۔ اور پھر فارملٹی کے ساتھ مسکرا کر بولی ——
"فلیٹ نمبر ٹین (۱۰)۔
"یس —— اینڈ یو۔ نمبر الیون" ——
وہ ہنس پڑی —— یہ ہمارا جدید ترین تعارف تھا۔ گویا نمبر ٹین اور نمبر الیون
میری سمجھ میں نہیں آیا کیا باتیں کروں —— میرے سارے اصول بے حد ہلکے محسوس ہوئے۔ لگا جیسے اچانک کسی شخصیت سے باتیں کرنا۔ جس کے متعلق پہلے سے ذہن نے بہت کچھ سوچ رکھا ہے بے حد مشکل ہوتا ہے۔
لیکن پھر بھی اندر کے تیں، پر باہر کے تیں، نے حاوی ہو کر کہا ——
"آج کی شام میں بور ہو رہا ہوں —— آر یو فری —— چلئے کہیں چل کر باتیں کریں" ——!
اس کی پیشانی کی شکنیں کچھ کم ہوئیں —— آنکھوں کی اجنبیت بھی زائل ہوتی ہوئی محسوس ہوئی اور اس نے کہا ——
"ایسی کوئی مصروفیت تو نہیں۔ چلئے گھر چلتے ہیں" ——
میں ایک بار پھر گھبرایا —— اگر وہ عام لڑکیوں کی طرح کسی کیبن والے ریستوران کو پسند کرتی تو بات میرے لئے کچھ نہ تھی! —— لیکن گھر چلنے تک کی یہ خود اعتمادی کچھ معنی رکھتی ہے اور یہ معنویت میرے لئے نئی تھی ——
وہ میرے ساتھ باہر نکلی —— اور میرے ساتھ ہی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ اور باہر کی طرف دیکھنے لگی —— لاتعلق سی ——
"آل رائٹ" —— میرے دل نے کہا —— اگر وہ نمبر ٹو لڑکیوں کی طرح مجھ سے ہر موضوع پر باتیں کرنے کی کوششیں کرتی اور کبھی اپنی اداؤں کا کبھی اپنی آواز کا اور کبھی اپنی ذہانت کا اثر ڈالنا چاہتی تو شاید میں اسے ذہن اتار دیتا —— مگر وہ میرے وجود سے لاتعلق تھی اور یہی لاتعلقی مجھے اچھی

طرف متوجہ کئے ہوئے تھی۔ کچھ دیر بعد اس کا فلیٹ آ گیا ــــــ بیچ میں ایک لمبی سی سڑک تھی اور دوسری طرف میرا گھر تھا ــــــ ڈرائیور کو میں نے واپس بھیج دیا اور اس کے ساتھ ہی ڈرائنگ روم میں داخل ہوا ــــــ

یہاں بھی اسکی انفرادیت مجھے چونکا گئی ــــــ کہ اس نے نہ تو مجھے کچھ پینے کو کہا۔ نہ میرے سامنے زبردستی چند بندھے ٹکے ریڈی میڈ نمکین کی پلیٹ رکھ دی۔ ایسا کچھ نہیں کیا اس نے۔ بلکہ خاموشی کے ساتھ اٹھی ــــــ فریج سے پانی نکال کر خود پانی لیا اور ایک گلاس مجھے دیا۔ پھر سامنے کی کرسی پر بیٹھ کر بولی ــــــ

"ہاں تو آپ کیوں بور ہو رہے ہیں؟ ــــــ ہاؤ کین ہیلپ یو؟" ــــــ

اس کے لہجے میں بڑی قطعیت تھی۔ مجھے اپنا قد بونا سا لگا۔ اور میں نے سنبھلتے ہوئے پوچھا ــــــ

"پہلے ہم انٹروڈیوز تو ہو لیں"! ــــــ

"شیور! ــــــ میں مسز امبیکا چودھری ہوں۔ میرے ہزبینڈ کناڈا میں سیٹل کر گئے ہیں ــــــ میں یہاں سروس کرتی ہوں۔ میرے بچے نہیں مگر میرے بہت سارے رشتہ دار ہیں ــــــ اینڈ دے آر مائی لائف" ــــــ

میں شاید کچھ اور بھی جاننا چاہتا تھا مگر نہ تو مجھے ہمت ہو رہی تھی۔ اور پھر میری ضرورت بھی کیا تھی؟ ــــــ اب تعارف کی میری باری تھی ــــــ اور ہمیشہ ہر کام ٹو دی پوائنٹ کرنے والی میری شخصیت بری طرح مات کھا گئی تھی اتنی ٹھوس، اتنی بھرپور اور اتنی گہری شخصیت کے سامنے میں آج شام کی روداد کیسے کہوں، جو ہر شام کے صفحے پر لکھی جاتی ہے اور شام ڈھلتے ہی وہ صفحہ میں پرزہ پرزہ کر کے بکھیر دیتا ہوں ــــــ کہیں شام میری توہین نہ کر دے ــــــ میں گھبرا رہا تھا ــــــ پتہ نہیں یہ عورت ــــــ امبیکا چودھری کیسی ہے؟ ــــــ کہیں وہ ذلیل کر کے مجھے گھر سے نہ نکال دے ــــــ کہیں وہ مجھے چیڈھا نہ کرے اور میں منہ چھپاتا پھروں ــــــ

عورت کا یہ ٹائپ میرے لئے نیا تھا ــــــ پھر بھی میرے

اندر کے پریکٹیکل آدمی نے مجھے تقویت دی اور میں نے کہا ———

"مجھے آج کی شام گزارنے کیلئے کسی پارٹنر کی ضرورت تھی ——— میں کافی پیسے خرچ کرتا ہوں اسکے لئے ——— آر یو ایگری؟" ———

یہ انگریزی کے الفاظ اکثر اسلحے کی طرح محسوس ہوتے ہیں کیونکہ جو کچھ ہم اپنی زبان میں نہیں کہہ پاتے وہ اس ذریعہ سے بڑی آسانی سے کہہ لیتے ہیں ———

پہلے تو وہ براہ راست میری طرف دیکھتی رہی پھر اٹھ کر اندر چلی گئی۔ کیا میں نے غلطی کی ——— ؟ ——— حالانکہ اس کمرشیل ایج میں لڑکیاں فاسٹ اور بہت فاسٹ ہوتی ہیں۔ یہ میرا یقین تھا ——— آج کی لڑکیاں پردیسی میں جانا نہیں چاہتیں۔ اور پھر آج سائنس نے ہر رشتے کو اس طرح میٹریکیٹیڈ بنا ڈالا ہے کہ نامہا دخوف بھی دیوار نہیں بنتا ——— لیکن یہ امبیکا چودھری ——— شاید سب سے الگ ہے ——— میں نے اس کے ڈرائنگ روم کو دیکھا ——— مگر کہیں کوئی "کلو" نہیں ———

نہ تو اس نے حد سے زیادہ قیمتی اور میڈان فلاں ——— فلاں سے آراستہ کر کے دولت مندی کا رعب ڈالا تھا ——— نہ اپنی نفاست طبع اور معیارِ ذوق کا رعب بٹھانے کی کوشش کی تھی ——— بس بے حد عام سا ڈرائنگ روم۔ ایک سیٹ صوفہ ——— چند کرسیاں ——— سینٹر ٹیبل کارنر ٹیبل پہ لیمپ ——— ایک چوکی پہ مناسب لبستر ——— چند ضروری تصویریں ——— ڈیٹ کیس اور کچھ نہیں۔

اچانک مجھے ڈر لگا ——— ایسی عورتیں جتنی زمین کے اوپر ہوتی ہیں اتنی ہی اندر بھی ——— مجھے ان کا کوئی تجربہ نہ تھا ——— اور میں ان سے دور ہی رہا کرتا تھا۔

"کیا وہ پولیس کو فون کرنے گئی ہے؟"

مگر یہ قطعی فضول تھا ——— وہ اپنی مدد خود کر سکتی ہے ———

"پھر" ———

"پھر؟" ؟ ———

مجھے بیٹھے بیٹھے اکتاہٹ سی ہونے لگی۔ معاً اندر کا پردہ ہلا ——— امبیکا شب خوابی کے، پاردرشک لباس میں

میرے سامنے تھی ــــــ گویا یہ شام میرے تجربے میں ایک اضافہ تھی! ــــــ

ماہنامہ آہنگ دسمبر ۱۹۷۹ء

ادھورے چہرے

کبھی بے حد عام سی بات، بہت ہی معمولی سا حادثہ بھی اپنی تکرار سے اپنا اعتراف حاصل کر لیتا ہے۔ وہ مجھے اچانک ہی محسوس ہوا۔ میرے انکل سیاسی قیدی کی حیثیت سے جیل میں تھے اور ہفتے کی شام میں ان سے ملنے جاتی ہوں۔ مجھے رشتہ داروں کی سیاست سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ یوں بھی عام سطح کی عام باتوں کو میرا ذہن قبول نہیں کرتا۔ یہ میری فطرت ہے اور مجھے اپنی اس عادت پر فخر ہے۔

آج کی انفرادیت کیا تھی، یہ میں صبح ہی صبح تو نہ جان سکی مگر مجھے کچھ عجیب سا محسوس ہوا ــــــ جیسے لاشعور میں اضطراب سا ہو۔ حدِ امکانات سے پرے، یہ راز کرنے والے دل نے نئی وسعتیں پالی ہیں۔ یا کوئی بے رحم رشتہ دنفی بیل کی طرح گھر گھر میرے وجود کو پاش پاش کرنے والا ہو ــــــ یوں بھی مجھے دیر تک سونے کی عادت ہے۔ اٹھی تو تھوڑی دیر بعد ہی کال بیل کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ یوں تو اس بھرے پرے گھر میں یہ بیل

بجتی ہی رہتی ہے۔ مگر بٹن دبانے کا وہ مخصوص انداز میرا جانا پہچانا تھا ـــــ جینا، میرے سامنے مقدس مسکراہٹوں کے اجالے لیکر آکھڑی ہوئی۔

"ہیلو ـــــ جینا" ـــــ میں نے حیرت اور خوشی سے پکارا ـــــ

"تم کب آئیں؟" ـــــ

"بس آج ہی ـــــ اور سب سے پہلے تمہیں کو ملی" ـــــ اس نے اپنے مخصوص انداز سے کہا ـــــ میں نے دیکھا، برسوں بعد بھی جینا وہی تھی ـــــ اس کی وہی فرشتوں جیسی ہنسی ـــــ اور ہنستے ہنستے اس کی گہری نیلی سبز آنکھوں میں پانی بھر آنے کا انداز وہی تھا ـــــ واقعی کچھ ہستیاں اپنے اندر ایسے اجالے رکھتی ہیں کہ ماہ و سال کے بے رحم ہاتھ ان سے کچھ نہیں چھین پاتے۔

جینا میرے ساتھ، میرے کمرے میں گھنٹوں باتیں کرتی رہی۔ دنیا بھر کی باتیں۔ لطیفے۔ دکھ کے سطحی اور کرب کے گہرے نشتروں کا ذکر کرتے ہوئے جب وہ دوپہر کی دھوپ ڈھلنے لگی تو مجھے یاد آیا

"مائی گڈنس ـــــ جینا ـــــ آج تو مجھے انکل سے ملنا تھا؟" ـــــ

"یس ـــ آل رائٹ ـــــ چلو چلتے ہیں" ـــــ جلدی جلدی کھانے سے فراغت پانے کے بعد جب میں اس کے ساتھ جیل کمپاؤنڈ میں داخل ہوئی تو ابھی وقت ہی نہیں ہوا تھا ـــــ

"چلو جیل کی سیر کرتے ہیں" ـــــ

"خیریت؟ ـــــ ایسا کیا ہوا ہے؟ ـــــ میں نے مذاقاً پوچھا ـــــ

" ـــــ بالکل ـــــ چلو ذرا "سی" کلاس دیکھیں" ـــــ

"مگر پرمیشن؟" ـــــ

"کم آن ـــــ اٹ ڈزنٹ میٹر!" ـــــ

جیلر شاید مشن کا پہچانا ہوا آدمی تھا ـــــ اس نے ہمیں خوش آمدید کہا ـــــ اور جیل کے احاطے میں رہبری کرنے لگا۔

"اکرم ـــــ" اچانک ایک قیدی کے پاس میرے پاؤں تھم سے گئے۔ پندرہ، سولہ سال کے اکرم کو قیدیوں کے لباس میں دیکھ کر میری انترآتما کے اندر کچھ ٹوٹ کر بکھر سا گیا۔ روح کے اندر کیسے کیسے بودے لگتے ہیں۔

اکھڑ جاتے ہیں۔ کب پت جھڑ بے آواز چلی آتی ہے۔ کب یقین کا کارگہہ
شیشہ گری چکنا چور ہو جاتا ہے۔ ان آہٹوں کو کون جان سکا ہے۔ یہ تو وہ
دھمک ہے جو اندر اندر روند ڈالتی ہے۔

دو تین سال کا وہ بچہ جو کریمن کو اچانک مل گیا تھا اس کیساتھ
حرامی پن کا لیبل لگا تھا۔ کیونکہ اس کے چہرے کے نقوش ایک سفید پوش
کی اندرونی سیاہی کی چغلی کرتے تھے اور جسکی ماں نے کنوئیں میں کود کر جان
دے دی تھی۔ کریمن میرے گھر کی ملازمہ تھی۔ گھر کے ان بکھیڑوں کی سپروائزر
اماں تھیں سبھی مجھے ان فضولیات سے کوئی سروکار نہ تھا پھر بھی بہت ضعیف سی
وہ عورت اپنی پاٹ دار آواز میں رحمو اور نالی والی سے جھگڑے کرتی تو مجھے برا بھی
نہیں لگتا بلکہ محسوس ہوتا جیسے اس آواز کا اس کی شخصیت سے گہرا تعلق ہے
نامحسوس مگر گہرا ——— حالانکہ مجھے شور اور ہنگاموں سے نفرت رہی ہے۔ آہستہ آواز
نرم لہجہ۔ اور کم سے کم الفاظ کا استعمال خود میری عادت ہے۔ اس کے باوجود
مجھے لگتا، جیسے اگر کریمن کی آواز گھٹ گئی تو گھر کی دیواریں چیخ اٹھیں گی
——— در و دیوار پکارنے لگیں گے بلکہ کریمن کی سخت آواز کے ساتھ
اکرم کی ننھی منی آواز مل جل کر ایک عجیب سا توازن پیدا کرتی وہ توتلی آواز میں
کریمن کو "نانی ماں" کہہ کے پکارتا۔
اور خوش ہوئی کریمن چیخ کر کہتی ———

"ارے چپ حرامی ——— مار چپکے جائے ہے ——— مگر اس کے
باوجود وہ چپکے سے اس کے لئے تام چینی کے پیالے میں چائے انڈیلتی اور
رات کی روٹی نکال کر چپ چاپ اس کے سامنے رکھ دیتی ———
وہ متشکرانہ نظروں سے کریمن کی طرف دیکھ کر آہستہ آہستہ کھانے لگتا ———
عورتیں شاید پیدائشی ماں ہوتی ہیں۔ کریمن تو لاولد تھی ——— پھر بھی
——— جیسے اب تک کی ساری ممتا اچانک لبریز ہو کر اس بچے کو شرابور
کر گئی تھی ——— وہ جتنا چیختی، اس سے کہیں زیادہ پیار کرتی۔ اسے
خود نہلاتی دھلاتی ——— کپڑے بدل کر اپنی موٹی موٹی پھٹی
پھٹی انگلیوں سے جب اسے کاجل لگا کر بائیں پیشانی پہ نظر کا بڑا سا ٹیکہ
لگا دیتی تو مجھے ہنسی آجاتی ——— ہاں اگر کبھی وہ کسی بات کے لئے ضد

کرتا تو کریمن کا شفیق اچانک بے رحمی کا آلہ کار بن جاتا ۔ وہ اسے بے تحاشا
پیٹنے لگتی شاید لاشعور کے اندر چھپے ہوئے بانجھ پن کی ٹیس شعور کو ڈھک دیتی
پھر اچانک شعور ابھر آتا ــــــ اور وہ اکرم کو سینے سے لگا کر خوب رو رو تی
سسک سسک کر روتی ۔ کتنے برس یوں ہی بیت گئے ۔ دیکھتے دیکھتے
اکرم چھ سال کا ذہین ، خاموش طبع اور نیک لڑکا بن گیا ۔ لیکن اس کی بڑھتی
ہوئی عمر کے ساتھ ہی اس کے حرامی پن کے لیبل کا ہر ایک اسمال لیٹر بھی
کیپٹل میں تبدیل ہوتا گیا ۔ گلی کے بچے اسے حرامی کہہ کے جب بھی چڑاتے ، وہ
بغیر سوچے سمجھے لڑ پڑتا ــــــ ایک بات مجھے شدت کے ساتھ متاثر
کرتی ــــــ وہ یہ کہ جب بھی کوئی اسے اسکے باپ کے خوفناک انجان چہرے
کے نقوش بتا کر اس کے ابھرتے ہوئے ذہن کو مفلوج کرنے کی کوشش
کرتا تو وہ سب کچھ چپ چاپ سن لیتا ۔ بلکہ اس کے چہرے پر انتقامی کیفیت
ابھر آتی ۔ لیکن اگر کوئی ماں کو گالی دیتا تو وہ عمر اور جسمانی طاقت کی پرواہ کئے بغیر
مرنے مارنے پر اتر آتا ۔ میں سوچتی ــــــ ماں کی ذلت روح کے اندر
اتر کر ناسور بن جاتی ہے اس ازلی سچائی کی مکمل اس ننھے سے اکرم میں کس
طرح موجود ہے ۔ یہ کون جان سکا ہے ۔ ان حالات میں اکرم کا مستقبل
کیا ہوگا؟ ــــــ سوال جتنا تاریک تھا ، جواب تاریک تر تھا ــــــ
میں نے کریمن سے کہہ کے اس کا داخلہ قریب کے پرائمری اسکول میں کرا دیا ۔
کتابیں کچھ تو اسکول سے مل گئیں کچھ خرید دی گئیں ۔ وہ میرا بھی نائنل
ایر تھا ۔ پھر بھی میں تھوڑا وقت نکال کر اسے پڑھانے لگی ۔ ویسے دراصل
میں اس کے ذہن کو پڑھنا چاہتی تھی کہ واقعی اس کا رجحان کیا ہے ؟ وہ بہت
ذہین تو نہیں تھا ــــــ لیکن اس کی نودجی نے مجھے شدت سے متاثر
کیا تھا ــــــ ہر دوسرے دن اسکی پنسل گم ہو جاتی ۔ کبھی ربر غائب
کبھی پنسل ندارد ــــــ میرے سخت لہجے کے وزن سے یا کہ اپنے اندر
کی سچائی سے وہ فوراً گھبرا کے کہہ اٹھتا ــــــ

" باجی ــــــ اختر کے پاس پنسل نہیں تھی ۔ اس لئے میں نے دے دی "

" انور کی کاپی نہیں تھی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ "

رئیش کا ربر کھو گیا تھا باجی اسلئے دے دیا ــــــ ورنہ وہ گھر میں پٹتا "

اس کے حساس دل کی معصومیت کریمن کی سمجھ سے باہر تھی یا کہ وہ صورتِ حال سے خوف زدہ ہو جاتی، لیکن جب بھی اکرم اپنی کوئی چیز کسی کو دے دیتا، وہ اسے مارنے جھنجھوڑنے لگتی ——

"دیکھئے ذرا —— اس حرامی کے لئے اتنا وقت خراب کرتے ہے —— گھر جا الگ، اور ای منحوس بڑا حاتم بنا ہے" ——

"چھوڑ دو بوا —— " میں اکرم کو الگ کر دیتی، اور اس کے بعد ایک سوال میرے ذہن میں آ ویراں ہو جاتا —— "آخر ایسے کیسے چلے گا —— اکرم کی تخلیق ہی جذبۂ وفا اور اعتماد کی انتہا کا ثبوت ہے۔ اس کا حساس دل جیکنا چور نہ ہو —— اس کے لئے اسے مضبوط بننا ہوگا۔ مگر اسی کے تحفظ کے لئے ایسا ماحول میں کہاں سے مہیا کروں —— جو نہ کسی گوشے میں ہے نہ کسی فرد کے ذہن میں" ——

میرا ذہن بھول بھلیوں میں گم ہو گیا تھا —— میں اکرم کے مستقبل کے لئے یوں فکر مند رہنے لگی جیسے اگر وہ تباہ ہوا تو اس کی کسی حد تک ذمہ داری مجھ پہ بھی ہو گی۔ مگر میں اس کے لئے کر ہی کیا سکتی ہوں —— اسکول کے بچے بھی کلاس کے درمیان میں کبھی دبے لہجے میں کبھی زور زور سے اور کھیل کے درمیان میں اکرم کو دھکیل دھکیل کر اس کے ذہن میں جائز ناجائز کے جہنم سلگایا کرتے —— اور وہی لوگ جب موقع ہوتا جب ضرورت ہوتی، اس سے فائدہ بھی اٹھاتے —— اس سے اس کی کاپی پینسل حتیٰ کہ کتاب تک مانگ لیتے ——

بہت ہی معصوم سا اکرم جیسے جیسے بڑا ہوتا گیا۔ اپنے دائرے میں سمٹتا گیا —— اب وہ اسکول کے بعد گھر میں ہی رہتا۔ کریمن کا ہاتھ بٹاتا، کبھی پودوں کو پانی دینے لگتا —— اور کبھی گم سم ہو کر سرِ شام ہی پڑھنے بیٹھ جاتا۔

وقت گزرتا رہا —— اب اس کا داخلہ ہائی اسکول میں ہو گیا۔ میں نے سوچا ماحول اور معیار کی تبدیلی شاید خوشگوار ہو۔ مگر اس کی تقدیر یہاں بھی اس کے ساتھ تھی —— میں چاہتی وہ زیادہ سے زیادہ توجہ تعلیم کی طرف دے۔ اور اس سلسلہ میں مجھ سے مدد لیا کرے —— ایسے

ہی ایک دن میں نے دیکھا ـــــ وہ شام کی ڈوبتی روشنی میں پچھواڑے کے بیل کے درخت کے نیچے کچھ لکھنے میں اس قدر منہمک تھا کہ اسے میری آہٹ بھی محسوس نہ ہوئی ـــــ

"کیا لکھ رہے ہو اکرم؟" ـــــ

وہ گھبرا کے اٹھ کھڑا ہوا اور جلدی سے کاپی بند کر دی ـــــ

"کیا ہوم ورک ہے؟" ـــــ

"نہیں باجی ـــــ وہ میگزین کے لئے ـــــ"

"لاؤ ـــــ دیکھیں تو ـــــ"

"ٹوٹتے سپنے" ـــــ عنوان لکھ کر وہ ایک کہانی لکھ رہا تھا۔ میلے میں کھوئے ہوئے بچے کے ذہن کا خوف، غیر محفوظ ہونے کا ڈر ـــــ اور لوگوں کے ہجوم سے وحشت کو اس نے اتنے اچھے انداز سے بیان کیا تھا کہ میں متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی ـــــ میں نے مناسب الفاظ میں اسکی ہمت افزائی کی ـــــ اور اسی وجہ سے مجھے اس کی طرف سے ایک گونہ سکون مل گیا تھا ـــــ اس کے مضطرب ذہن کو اظہار کا ایک وسیلہ مل گیا تھا ـــــ یوں وہ بجائے اندر اندر گھٹنے کے اپنے حساس ذہن کو سمیٹ سکے گا ـــــ غم کی انتہا اگر ذہنی توازن بگاڑ دیتی ہے تو یہی غم فن کی تابناکی کا وسیلہ بھی ہوتا ہے یہ مجھے پتہ تھا ـــــ

اکرم کی کہانی میگزین میں آ گئی ـــــ انعام کے طور پر ایک قلم دے کر میں نے اس کی مزید لکھنے کے لئے ہمت افزائی کی۔ اور اسے نئے موضوعات دئے ـــــ دو سال یوں ہی گزر گئے ـــــ اکرم معمول کے مطابق اسکول جاتا ـــــ ہر سال پاس ہو جاتا ـــــ میرے ٹوکنے پر کبھی شرمایا شرمایا سا اپنی کاپی میرے حوالے کر جاتا ـــــ میں تصحیح کرتی ـــــ اور گرامر کو اس کے رد دیے کے متعلق سمجھاتی رہتی کہ ایک دن عجیب سا واقعہ ہو گیا ـــــ اکرم نے کلاس کے ایک لڑکے کو مارا تھا۔ اتفاق سے وہ کسی ٹیچر کا رشتہ دار تھا ـــــ کافی لے دے ہوئی ـــــ اسکول کے تمام لڑکوں نے مل کر اکرم کو طرح طرح سے نوازا تھا ـــــ کسی نے گالیاں دیں۔

ـــــــ کسی نے حرامی کہا ـــــــ کسی نے کریمن کی ہانڈی گیری کا مذاق اڑایا ـــــــ اکرم کو فائن چارج کا شکایت نامہ ملا ـــــــ جسے لیکر اکرم کو کوستی ہوئی کریمن میرے پاس پہونچی ـــــــ میں نے اس کو بلوایا۔ میرے پوچھنے پر پہلے تو وہ خاموش رہا ـــــــ پھر اچانک بول اٹھا ـــــــ

"باجی ـــــــ وہ کہہ رہا تھا ـــــــ "تمہاری ماں رنڈی تھی" ـــــــ میں نے کہا ـــــــ "میری ماں شریف تھی ـــــــ میرا باپ بے نام اور بے چہرے کا ہے ـــــــ وہ کوئی بھی ہو سکتا ہے ـــــــ میں یا تم" ـــــــ بس وہ پل پڑا ـــــــ میں نے بھی مارا ـــــــ میں فائن نہیں دوں گا" ـــــــ

میں چونک اٹھی ـــــــ یہ اکرم نہیں، اس کا احساس دل، اس کا فنکار ذہن، اس کا بے لوث کردار بول رہا تھا ـــــــ کہ ان آوارہ دوں کا یہی مقدر ہوتا ہے ـــــــ لیکن میں اس کا تحفظ چاہتی تھی ـــــــ تاکہ درد کا یہ خزانہ کبھی ٹوٹے بکھرے دلوں کا مداوا بن کر ابھر سکے ـــــــ میں نے اُسے اپنے مخصوص، پیار اور مدھم لہجے میں سمجھایا ـــــــ معافی نامہ لکھ کر دیا اور فائن کی رقم بھی ـــــــ لیکن اس دن کے بعد اکرم اسکول سے لوٹ کر نہیں آیا ـــــــ میں ڈھونڈ کر اور کریمن رو رو کر ہار گئی ـــــــ نہ اسکول گیا ـــــــ نہ گھر لوٹا ـــــــ کریمن اس کے حرامی پن کا احساس کر کے صبر کر چکی تھی ـــــــ لیکن میرے اندر ایک اضطراب اور ایک مبہم سی امید باقی تھی ـــــــ

اور آج اسے جیب کترے کی حیثیت سے سلاخوں کے پیچھے دیکھ کر مجھے محسوس ہوا جیسے مکمل اکرم، ٹوٹ کر، بکھر کر ادھورے چہروں میں مل گیا ہو ـــــــ یہی اسکی پہچان ہو اور میں بغور اسے دیکھتی رہی کہ اس کی تکمیل کو نامکمل کس نے کیا ہے؟ ـــــــ

پھانسی کا پھندہ

ڈاکٹر مجھے پیتھیڈین دے کر گیا ہے۔ کچھ دیر بعد آپریشن ہوگا اور میرے جسم کے اندر سے اس زخم کو نکال کر الگ کر دینے کی کوشش کی جائے گی جسکی مجھ سے وابستگی ۱۵ برس پرانی ہے جس کے وجود کا احساس مجھے کبھی کبھی بہت ہی مدھم سی درد کی لہروں کی شکل میں ہوتا رہا ہے۔ جیسے، کسی نے سوئی کی نوک چبھا دی ہو، پھر آہستہ آہستہ محسوس ہونے لگا جیسے کسی نے چٹکی بھر لی ہو یہی احساس چند مہینوں سے نشتر کے وار جیسا ہو گیا ہے ــــــ

مجھے اپنے اس زخم کا احساس بہت پہلے ہو چکا تھا۔ اگر میں چاہتا تو ڈاکٹروں کے مشورے پر عمل کر کے صحت یاب بھی ہو سکتا تھا۔ لیکن مجھے اپنا یہ زخم از حد عزیز ہے۔ کیونکہ یہ میرے گذشتہ پندرہ برسوں کے لمحے لمحے کی ڈائری ہے ــــــ روح کے گہرائیوں کی ہ

کتاب ہے جس کا لفظ لفظ خون سے تر بتر ہے۔ مضراب کی وہ صدا ہے جسکے ہر اتار چڑھاؤ کے ساتھ تاروں کے ٹوٹنے کا کرب ہم آہنگ ہے۔

ابھی جبکہ میرا ذہن تاریکیوں کے سمندر میں غوطہ زن ہے مجھے نہ جانے کیوں احساس ہونے لگا ہے۔ اگر یہ زخم مجھ سے الگ کر دیا گیا تو میں جی نہ سکوں گا۔

صبا! ——— اس زخم کی ابتدا تم ہو ——— کاش انتہا کے اس منظر میں تم کہیں سے شریک ہو جاؤ ——— اور دیکھ سکو کہ ٹوٹنے اور بکھرنے کا سین کیا ہوتا ہے ———؟ میں نے ایک مرتبہ تم سے کہا بھی تھا ——— "لاسٹ سین آف دی لاسٹ ایکٹ کے لئے بڑے پیشن کی ضرورت ہوتی ہے" ——— اور تم نے ہنس کے ٹال دیا تھا ———

"مے بی" ——— شاید تمہیں خود بھی پتہ نہ ہو کہ انگریزی کے ان دو لفظوں میں تمہاری خطرناک کا انش انسی سمٹ آیا تھا ——— مگر تم ہمیشہ کی طرح دامن بچا گئی تھیں ——— اعتراف کی بلندیاں ہر ایک کے بس کی نہیں ہوتیں۔

صبا! ——— قطعی نہیں ——— ورنہ میں نے تم سے کب نہیں کہا تھا ——— میں نے تو ہمیشہ تمہیں روح کی ان گہرائیوں سے پکارا تھا کہ روح کی خراشیں میری زندگی کا ہر ایک پل لہو لہان کر گئی تھیں ———

میں نے ایک مرتبہ تمہیں لکھا تھا ——— شاید آخری بار ——— خدا کرے تم ترقی کی بلندیوں کو چھو لو، کہ تمہاری رفعتوں کی اطلاع مجھے مل ہی جاتی ہے، ویسے میری دعا ضرور ہے کہ میرے مرنے کی اطلاع بھی تم تک نہ پہنچے ———

اور حسب عادت تم خاموش رہیں ——— لیکن مجھے نہ تمہارے جواب کا انتظار تھا اور نہ تمہاری خاموشیوں سے گلہ ———

زاہدہ اور تم ایک ساتھ ہی میری زندگی میں داخل ہوئی تھیں ———

زاہدہ میری بیوی تھی ——— مگر جس سے مجھے بے انتہا

نفرت تھی اور تم اس معاشرتی دنیا میں میری کوئی نہ تھیں ـــــ مگر کیا رشتہ محض ناموں کا پابند ہوتا ہے ـــــ؟ کیا تم اس کانٹریکیٹڈ ہستی کو سمجھ نہیں سکتی تھیں؟ ـــــ جو میری زنجیر تو تھی لیکن سنگِ در نہیں ـــــ تمہاری طلب میری روح کا ناسور بن گئی ـــــ غلطی کہاں تھی؟ ـــــ کیسی تھی؟ ـــــ میرے پاس ان سوالوں کا کوئی جواب نہیں۔ سوال اور جواب کی دنیا بڑی منطقی اور باہری ہوتی ہے ـــــ اگر ہر آدمی ہر جذبے کو نفع و نقصان کی میزان پر تولنے لگے تو شاید بات برابر کرنے کے لئے وہ اپنی انتر آتما کا سب سے قیمتی حصہ ختم کرتا جاتا ہے ـــــ

آج تم سے بہت ساری باتیں کہنی ہیں ـــــ اس لئے میں بتا دوں، زندگی کے اچیومنٹس اور لاسیس (Achievements and losses) میں فرق نہیں ہوتا ـــــ فاصلے کی یہ لکیر ہمارا ظرف ہی بناتا ہے ـــــ میں خود ہی ایک ذمہ دار انسان تھا ـــــ میں نے ہمیشہ شادی شدہ لوگوں کے عشق کو احساس کمتری اور ہوس کا نام دیا تھا ـــــ لیکن بعض لمحے، کسی بھی اصول اور قانون کے پابند نہیں ہوتے، ـــــ یہی لمحے تو اصلِ حیات ہوتے ہیں ـــــ جب تم مجھے پہلی مرتبہ ملیں تو میری روح کس طرح سجدہ ریز ہوئی میں کیسے کیسے خود کو ہار گیا اس کا تجزیہ کرنا میرے بس کی بات نہیں ـــــ میں غزل کا شاعر تھا ـــــ کم گو ـــــ اور تیز فہم ـــــ تم اکثر مجھ سے میرے شعروں کے معنی پوچھا کرتیں اور میں سادگی سے سمجھاتے سمجھاتے اچانک چپ ہو جاتا۔ تم شرارت سے ہنسا کرتیں۔ مگر تم اردو غزل کی روایتی شخصیت نہیں ـــــ کوئی بھی پل ہو ـــــ کوئی سا موسم، تم روایتوں اور اصولوں کے غلاف سے باہر نہ آ سکیں ـــــ میں نے بہت چاہا ـــــ تم میری طرح سوچ سکو ـــــ مگر نہ یہ میرے بس کا تھا، نہ تمہارے اختیار کا ـــــ بلکہ جب میں نے سنا، تم نے یہ کہا ـــــ میرا ہنس ـــــ نہیں، ایسے لوگوں کا مذاق اڑایا ہے جو کسی بیوی کے شوہر ہوتے ہوئے کسی کے لئے زندگی اور موت کی

سرحد چھو لیتے ہیں، ——— تو میرے زخم کی ٹیس اور بڑھ گئی —
اور اسی لمحے میرے دل نے میرے اس مرض کو سلام کیا ———
اس اعتراف کو، کہ یہ جو کچھ بھی تھا ——— تم سے متعلق تھا ———
تمہاری وجہ سے تھا ——— تم نہ سہی ——— میرے اندر کچھ تو ہے
جو تم سے اور صرف تم سے وابستہ ہے۔ کہ روح کا وہ گوشہ، انتہا
کی وہ گہرائی ——— پیاس کا وہ صحرا، ہر ایک کیلئے نہیں
ہوتا ——— میں تمہیں جھنجھوڑ کے جگا دینا چاہتا تھا ———
مگر کس لئے، مجھے پتہ نہ تھا، میں توضیح نہیں کر سکتا کہ اعتراف کی
اصلیت کیا ہوتی ہے ———؟

زاہدہ ——— میرے لئے روایتی بیوی کی حیثیت
رکھتی ہے ——— وہ روایتی حیثیت سے الگ بھی کچھ ہو سکتی تھی
یہ میں جانتا ہوں، مگر میں نے اس کی طرف کبھی توجہ نہیں دی۔ حالانکہ مجھے
پتہ ہے ——— بیوی کا رشتہ کارگہ شیشہ گری سے کم نہیں
ہوتا ہے ——— مگر اس کی فکر تو وہ کرے جسے شیشوں کو بچا کے
رکھنے کی تمنا ہو ——— میں تو کرچیوں سے لہو لہان زندگی کو گوشہ
چمن سمجھنے کا عادی ہو چکا ہوں ——— سیڈیزم sadism جو انجوائے
منٹ کی ہلکی سی لکیر ہوتی ہے ——— وہ دراصل زندگی کی مفصل
کتاب کا عنوان ہوا کرتی ہے ——— کاش تمہارے تخیل میں بے رُخی
کی جگہ عام سی ایک ہمدردی ہوتی ———

ہاں تو زاہدہ بالکل عام سی عورت ہے ——— سگھڑ بھی اور
مزاجاً بھی، ——— میں اسے جو بھی دیتا ہوں۔ خوشی سے گوارہ کر لیتی
ہے ——— اگر میں ناراض ہوتا ہوں، وہ مجھے منا لینے کے لئے سب کچھ کرتی
ہے، ——— اگر میں تھکا ہوتا ہوں ——— میرے پاؤں دباتی
ہے، سر دباتی ہے، کپڑے دھو کر آئرن کرتی ہے ——— میری انا نے
کس کس طرح اسے پاش پاش کیا ہے، یہ میں ہی جانتا ہوں ———
کبھی میں اسے سینما یا شاپنگ کے لئے تیار ہونے کو کہتا ہوں اور جب
وہ تیار ہو جاتی ہے تو نہ صرف انکار کر دیتا ہوں بلکہ بے بات کے جھگڑے

کو اسقدر طول دیتا ہوں کہ اس کی ہچکیاں لگ جاتی ہیں ـــــ ایسا
اکثر اس دن ہوتا ہے جس دن تمہارے خط کا شدید انتظار ہوتا ہے۔
ـــــ اور حسب معمول تمہارے خط کے نہ ملنے پر تمہیں ایک اور خط
لکھ چکا ہوتا ہوں ـــــ کچلی ہوئی انا بڑی خطرناک ہوتی ہے۔ زاہدہ
خصوصی طور پر میری نفرت کی زد پہ ہوتی ہے ـــــ وہ آج کی گندھاری
ہے ـــــ اس نے اپنی کھلی آنکھوں پر عقیدت کی پٹی باندھ رکھی
ہے ـــــ پھر بھی اسے وہ نیچ میسر نہیں جس سے وہ اپنے اکلوتے
بیٹے راشد کو ہر خیر و شر سے محفوظ کر سکے ـــــ وہ ہمیشہ اپنے بیٹے
کے مستقبل کے لئے پریشان رہا کرتی ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ دوسری
عورتوں کی طرح میرے ساتھ مل کر اپنے بیٹے کی آئندہ زندگی باتیں کرے جو
عورت کا سب سے خوش آیند خواب ہوتا ہے ـــــ مگر اسے کبھی ہمت
نہیں ہوئی، وہ مجھ سے ڈرتی رہتی ہے ـــــ لیکن میں کس سے ڈرتا
ہوں؟ ـــــ صبا تم سے، یا حالات سے، یا آنے والے بجر دلوں
سے ـــــ ایک دفعہ تم نے پوچھا تھا۔
"آخر ایسے کیا ہوتا ہے"؟ ـــــ یہ سوال اہم تو ہے ـــــ لیکن
جب امکانات کے سارے دروازے بند ہو جاتے ہیں تو ناممکنات پہ یقین
ہونے لگتا ہے۔ تم یقین کرو نہ کرو ـــــ میں نے مزاروں پہ
جا کے تمہیں مانگا ہے ـــــ کیونکہ میں جانتا ہوں، تمہیں میری رادھا
کو کسی سری رام نے برہ کی بد دعا نہیں دی ہے ـــــ لیکن تمہیں اس کا
احساس ہے بھی یا نہیں ـــــ یہی سوال تو میرے گلے کے لئے
پھانسی کا پھندہ بن گیا ہے ـــــ لیکن جس کا دم گھٹتا رہا وہ زیب تھا،
نہ تم تھیں، بلکہ زاہدہ تھی ـــــ
یاد ہے کہ ایک دفعہ تم نے، گھنٹوں باتیں کی تھیں ـــــ
باتوں کا سلسلہ بن صباحی جنت کی طرح تھا ـــــ ہم دونوں نے ہی محسوس
کیا تھا ـــــ ہمارے خیالات، نظریات اور احساسات، ہماری پسند ناپسند
میں گہری یگانگت ہے۔ اگر ہماری زندگیاں باہم گزرتیں تو احساس شکست وحرومی،
نشاط کا بوجھ نہیں لیا نہ کرتا ـــــ مگر شاید ایک ساتھ ہی ہمارے

خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا تھا ——— ہم دونوں نے ہی چونک کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا ——— تم نے اٹھتے ہوئے کہا تھا ——— "بہت دیر ہو گئی ——— چلیں اب ——— تقدیر کی جبریت کا کوئی علاج نہیں" ——— لیکن جب علاج باہر نہیں ہوتا تو اس کا ری ایکشن اندر ہونے لگتا ہے ———

جب جب یہ ردعمل ہوا ——— میں نے پاس کے بستر پر سوئی ہوئی زاہدہ کو اپنے پاس بلا لیا ——— اسے بیوی کی طرح استعمال کیا ——— وحشیوں کی طرح لوٹا کھسوٹا ——— اور جب وہ تھک کر چور چور ہو گئی ——— میں دوسری کروٹ سو گیا ——— مگر ہمیشہ ہی ایسی دوسری صبح زاہدہ کے لئے تلوار کی دھار بن کر آئی ——— وہ سوچتی شاید اس صبح، وہ میری توجہ کا مرکز ہے۔ ——— میں اسے اپنائیت اور پیار کی نظروں سے دیکھوں گا ——— مارننگ ٹی کے وقت پیالی لئے ہوئے اس کے پاس جا بیٹھوں گا ——— اس کے بھیگے بھیگے بالوں کی خنکی چھو کر محسوس کروں گا ——— مگر ایسا کچھ بھی محسوس نہیں ہوتا۔ بلکہ دوسری صبح مجھے اس سے اور بھی نفرت ہو جاتی - میں بات بات پر اسے اس طرح جھڑکتا، پھٹکارتا ——— جیسے وہ میری بیوی نہ ہو، اخبار کا وہ صفحہ ہو جس میں سبھوں کے رزلٹ تو ہوں لیکن اپنا نام یا اپنی پہچان کہیں نظر نہ آئے ——— حالانکہ مجھے ذاتی طور پر اس کا تجربہ بھی نہیں ہے ——— پھر بھی میں نے ہمیشہ یہی محسوس کیا ہے ——— اور اپنی شدید نفرت کے بوجھ تلے خود ہی دب گیا ہوں۔

آہستہ آہستہ یہ ٹوٹنے کا احساس بھی جکڑنے لگا ہے ———

تمہارا خط مہینوں بعد کبھی ایک دو جملے کا آجاتا ——— جیسے دھوپ سے پھٹتی بنجر زمین پہ کسی نے پانی کی دو بوندیں ٹپکا دی ہوں ——— ہو سکتا ہے تمہارے تحت الشعور میں جیون دکشن بننے یا ہونے کا بھرم پوشیدہ ہو ——— تم نے سوچا ہو، شاید تمہاری نفرت، تمہاری لاتعلقی سے، ردعمل کے طور پر میں اپنی بیوی کی طرف لوٹ آؤں گا۔ ——— مگر شاید تمہیں پتہ نہیں ——— کسی کو یاد کرنا اور بھول جانا آسان جیسا نہیں ہوتا

——— اور پھر صبا! ——— میں جانتا ہوں، عورت کیا ہوتی ہے ——— تم نے ایسا کبھی نہیں چاہا ہوگا ——— قطعی نہیں ——— تمہیں مجھے تڑپتا ہوا، بے چین بے چین دیکھنے سے خوشی ہوتی ہوگی ——— کاش تم ان کہی کی خلش سمجھ سکتیں ——— تم جانتیں، وفا کی محرومی اور بے وفائی کے کرب میں کتنا فرق ہوتا ہے ——— میں جانتا ہوں، تم بڑی سمجھدار ہو ——— ڈپلومیٹ اور نارمل ——— جو کہنے کا مقصد تم نے اپنا رکھا تھا ——— وہ میں بھی جانتا ہوں ——— مجھے بھی شروع سے ہی اندازہ تھا کہ زندگیوں کی لاشوں پہ جو کچھ بنتا ہے وہ خوابوں کا محل نہیں، بھوتوں کا مسکن ہوتا ہے۔ مگر تم نے کبھی اپنی وفا کا اعتراف بھی تو نہیں کیا۔ ——— کہا بھی نہیں ——— تم کیا سوچتی ہو، ——— تمہاری آرزوؤں کی انتہا کیا ہے ——— شاید تم نے سمجھا ہو اگر تم نے اپنے خوابوں کے دریچے وا کر دئے تو شاید میرے اندر تپش کی جگہ طمانیت ابھر آئے گی۔ اور میں تم سے دور ہٹتا جاؤں گا ——— نہیں، صبا، ایسا ممکن نہیں تھا ——— تمہیں پتہ نہیں، وفا کی انتہا کیا ہوتی ہے ——— اگر مائیکل مدھوسدن دتہ کو مٹی کی پکار اس قدر عظیم بنا سکتی ہے تو من تو شدم، تو من شدی کی انتہا، کیا وہ الگ الگ حلقے دائرے اور حد بندیوں کے درمیان ہمیں طمانیت اور تکمیل نہیں دے سکتی تھی ———

درد کا وہ احساس جو پہلے مدھم تھا ——— اب بہم ہونے لگا ہے۔ اب میں زاہدہ کو ہی نہیں، راشد کو بھی جھڑک دیتا ہوں ——— کیونکہ اب زاہدہ پہ میری زیادتیوں کا کوئی ردعمل نہیں ہوتا ——— وہ بالکل خاموش رہ جاتی ہے۔ شاید وہ احتجاج کی طاقت لوز کر چکی ہے ——— اس لئے میں اسے جلانے اور چڑانے کیلئے جو کچھ اسے کہنا چاہتا ہوں وہ اب اسے نہیں راشد کو کہتا ہوں۔ شاید یہ میرے اندر کے ہارے ہوئے مرد کو اس کا اندازہ ہے کہ ماں کے سامنے اگر بچے کے متعلق لشت ہاپشت کی بکواس دانیاں کرتا ہے تو خنجر ماں کی کن گہرائیوں میں پیوست ہوتا ہے ———

مگر مجھے مکمل خوشی اور طمانیت کا احساس نہیں ہوتا۔ خصوصاً تب جب راشد کی ڈبڈبائی آنکھوں کو دیکھتا ہوں تو لگتا ہے جیسے میرے اندر کچھ

ٹوٹ کے بکھر گیا ہو ——— آہستہ آہستہ جھنا کے کی یہ آواز میرے پیٹ
کے ایک مخصوص کونے میں سینیٹرلائزڈ ہو گئی ہے ——— اور میں مجبوراً
اس ٹیبل پہ لٹا دیا گیا ہوں جہاں سے کوئی زندہ واپس نہیں ہوا ———
آپریشن کامیاب نہیں ہوا ——— اسی لئے
میرے عزیز، دوست، رشتہ دار، سبھی میرے بے ہوش ہونے سے پہلے
مجھ سے ملنے آئے ہیں ——— سب کی آنکھوں میں ہمدردی اور محبت
کے قطرے لرز رہے ہیں ——— الفاظ کے لٹے ہوئے خزانے میں
میرے پاس کہنے یا سننے کا کوئی بھی لفظ نہیں ہے ——— میں ان کی
طرف دیکھتا ہوں تو وہ میری طرف دیکھتے ہیں ———

اچانک ایک مخصوص آہٹ نے مجھے چونکا دیا ——— وہی
آہٹ جس کا میں تمام عمر منتظر رہا ——— چلنے کا یہ انداز میرا جانا
ہوا ہے ——— لیکن یہ آج کیا ہوا؟ ——— وہ آخر کون ہے؟
——— کہ اس کے آنے کی مجھے مطلق خوشی نہیں ہوئی ———
بلکہ ایک عجیب بات ——— شاید زندگی میں پہلی بار، مجھے احساس
جرم نے کیوں جکڑ ڈالا ——— اور میں نے چونک کے زاہدہ کیطرف
کیوں دیکھا ——— ؟

مگر میری حیرت سے پھٹی ہوئی آنکھیں زاہدہ کے چہرے
سے پیوست ہو کے رہ گئی ہیں ——— کیوں کہ اسکی آنکھوں کے
آنسوؤں کے پیچھے بیزاری اور نفرت کی دھواں دھواں سی آگ موجود ہے۔
——— پھر میں نے صبا کو دیکھا ——— اسکی پلکوں پہ
آنسوؤں کے قطرے ہیں ——— اور چہرے پہ بیزاری سی ———
اور مجھے زندگی میں پہلی بار محسوس ہوا جیسے میرے گلے میں
کسی نے پھانسی کا پھندا ڈال دیا ہو ——— میرا دم گھٹ رہا ہو
میرا جی چاہا اس پھندے سے خود کو آزاد کر لوں ———
مگر کمپوز کا انجکشن میرے بازو میں اتار دیا گیا!!! ———

میں جاں بلب ہوں ترکِ تعلق کے زہر سے
وہ مطمئن کہ حرف تو اس پر نہ آسکے گا۔

ہماری ادبی کتب

۱- ڈراما انار کلی معہ مقدمہ مرتب :- پروفیسر حیدر عباس رضوی 7/50

۲- اردو ڈراما اور انار کلی از سید حیدر عباس رضوی 4/50

۳- اردو شاعری میں مستعمل تلمیحات و مصطلحات ڈاکٹر حامد حسین 30/00

۴- اردو ترجمہ اسرار خودی از :- ڈاکٹر حامد حسین 4/50

۵- باغ فکر معروف بہ مقطعات ناسخ از :- محمد خالد عابدی 8/00

۶- ادب اور لسانیات از :- ڈاکٹر ایس اے صدیقی 15/00

۷- نامۂ گل (شعری مجموعہ) مختار شمیم 5/00

۸- پس غبار (ماہیوں کا مجموعہ) مختار شمیم 6/00

۹- ملاقات (مولانا محمد عمران خاں) انٹرویو از :- ڈاکٹر اخلاق اثر 3/00

۱۰- دولت کونین (منظوم احادیث) از :- منیر بھوپالی 5/00

۱۱- چہل حدیث منظوم از :- قاضی وجدی الحسینی صاحب 10/00

۱۲- مٹھی بھر دھول از :- قمر جمالی 15/00

ملنے کا پتہ

بھوپال بک ہاؤس بدھواڑہ - بھوپال

ADHURE CHEHRE

by

SHAMIM SADIQA

Bhopal Book House, Bhopal

Pasha Printers Lakherapura, Bhopal